اس کا جسم حوصلوں سے، دل جذبوں سے اور آنکھیں سپنوں سے معمور تھیں... اور حالات کو سازگار کرنے کی تڑپ بے پناہ مگر...

ش صغیر ادیب
بلیک برن (یو۔ کے)

خوابوں کے نگر

قارئین! ش صغیر ادیب صاحب طویل عرصے سے سمندر پار مقیم ہیں اور وہیں سے وقتاً فوقتاً ہمیں اپنی نگارشات سے نوازتے رہتے ہیں۔ ہم وطنوں پر غریب الوطنی میں گزرنے والے مصائب اُن کا خاص موضوع ہے۔ یورپ میں رہ کر اُنھوں نے اردگرد کے حالات اور انفرادی و اجتماعی مسائل پر بہت سی شاہکار کہانیاں لکھیں۔ زیرِ نظر داستان ان میں نمایاں اضافہ ہے۔ یہ اُن افراد کی کہانی ہے جو نمود و نمائش کے دلدادہ معاشرے کے پیدا کردہ بالواسطہ معاشی دباؤ پر یا مجبوری و ضرورت کے تحت اپنے مسائل کا حل بیرونِ ملک تلاش کرتے ہیں۔ بہ ظاہر چمکتی دمکتی دُنیا کی ترغیبات اُنھیں یُوں کشش کرتی ہیں کہ وہ غیر قانونی قدم اُٹھانے سے بھی نہیں چُوکتے۔ اس طرح، اپنے تئیں روشنی کی تلاش میں نکلنے والے یہ ضرورت مند اندھیروں میں جا بھٹکتے ہیں۔ ان کی کوئی جائے پناہ ہوتی ہے نہ پہچان... اور بُری گھڑی ہر لمحہ اُن کے تعاقب میں رہتی ہے۔ اپنے عدم سے عبارت وجود کے ساتھ وہ سہمے سہمے رہتے ہیں۔ اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں اور اپنے اثبات کی نفی کرتے رہتے ہیں۔ سراب کو اپنے خوابوں کا نگر سمجھ کر لاحاصل جستجو میں سرگرداں رہنے والوں کو یہ بھی خبر نہیں ہو پاتی کہ کب خواب مرگ سے دوچار ہوئے اور آنکھوں کو ویران کر گئے۔ یہ داستان ایسی ہی لاحاصل ویرانیوں میں چنگھاڑتی حقیقتوں کی بازگشت ہے۔

انہوں نے بریک کی چرچراہٹ سنی، پھر انجن بند ہونے کی آواز آئی۔ انجن بند ہوا تو معاً ایک گہرا سکوت مسلط ہو گیا۔ اس سکوت میں اگر کوئی آواز ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی تو وہ ہوا کی سرسراہٹ تھی۔ وہ دم سادھے بیٹھے رہے اور دبیز تاریکی میں ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے۔ دل کی دھڑکنیں یوں بڑھ گئی تھیں جیسے کوئی ہتھوڑے سے پتھر کوٹ رہا ہو۔ اور وہ خوف جو انہیں کئی دنوں سے گھیرے ہوئے تھا، لمحہ بہ لمحہ ان کے دل و اعصاب کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہا تھا۔ خوف..... انجانا، اَن دیکھا خوف اور اندیشے، سانپوں کی طرح کلبلاتے ہوئے اندیشے۔ اب کیا ہوگا؟ اگلے لمحے کیا ہوگا۔ ہونی کا کون سا روپ ہمارے سامنے آئے گا۔ کئی مشکل اور پُرخطر مراحل سے تو گزر آئے ہیں، آگے کن مراحل کا سامنا کرنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بام پر پہنچنے سے پہلے ہی کمند ٹوٹ جائے۔ وسوسوں میں گھرے ہوئے وہ چپ چاپ بیٹھے رہے اور باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کرتے رہے۔ انجن تو بند ہو گیا تھا لیکن کوئی اور آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ایسا سناٹا تھا کہ ان کا دم گھٹنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" یکایک علی نے جوگندر سنگھ سے کہا۔

"پتا نہیں۔" جوگندر نے زیرِ لب سرگوشی کی۔

"میرا خیال ہے، شاید پہنچ تو گئے ہیں۔" دفعتاً راجا بھی ان کی سرگوشیوں میں شامل ہو گیا۔

"کون سی جگہ ہوگی یہ؟" علی نے تفکر آمیز لہجے میں پوچھا۔

"معلوم نہیں، شاید لندن ہو؟" جوگندر نے جواب دیا۔

خاموشی کا ایک وقفہ گزرا۔ پھر علی نے کہا "بھائی مجھے تو بہت سردی لگ رہی ہے۔ پاؤں سن ہو گئے ہیں۔"

"ہاں یار، بڑی زبردست ٹھنڈ ہے۔" جوگندر نے کہا۔

علی نے زور سے سانس لی "ارے بھائی لندن ہے، سردی تو ہوگی ہی۔" پھر وقفہ دے کر بولا "تمہارے خیال میں ہم لوگوں نے کتنی دیر سفر کیا ہوگا؟"

راجا نے سوچتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے پانچ گھنٹے تو ضرور ہو گئے ہوں گے۔"

"پتا نہیں آگے کیا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے۔" علی کے لہجے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

"نہیں بھائی گھبراؤ مت، اوپر والے نے چاہا تو سب ٹھیک ہی ہوگا۔" جوگندر نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

پھر وہ چپ ہو گئے اور انتظار کرتے رہے۔ ان کے کان بدستور باہر کی جانب لگے ہوئے تھے۔ مگر کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ کئی منٹ شدید اور جان سوز انتظار میں گزرے۔ پھر یکایک دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ غالباً فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھلا تھا۔ پھر کسی نے کچھ کہا۔ مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر قدموں کی مدھم

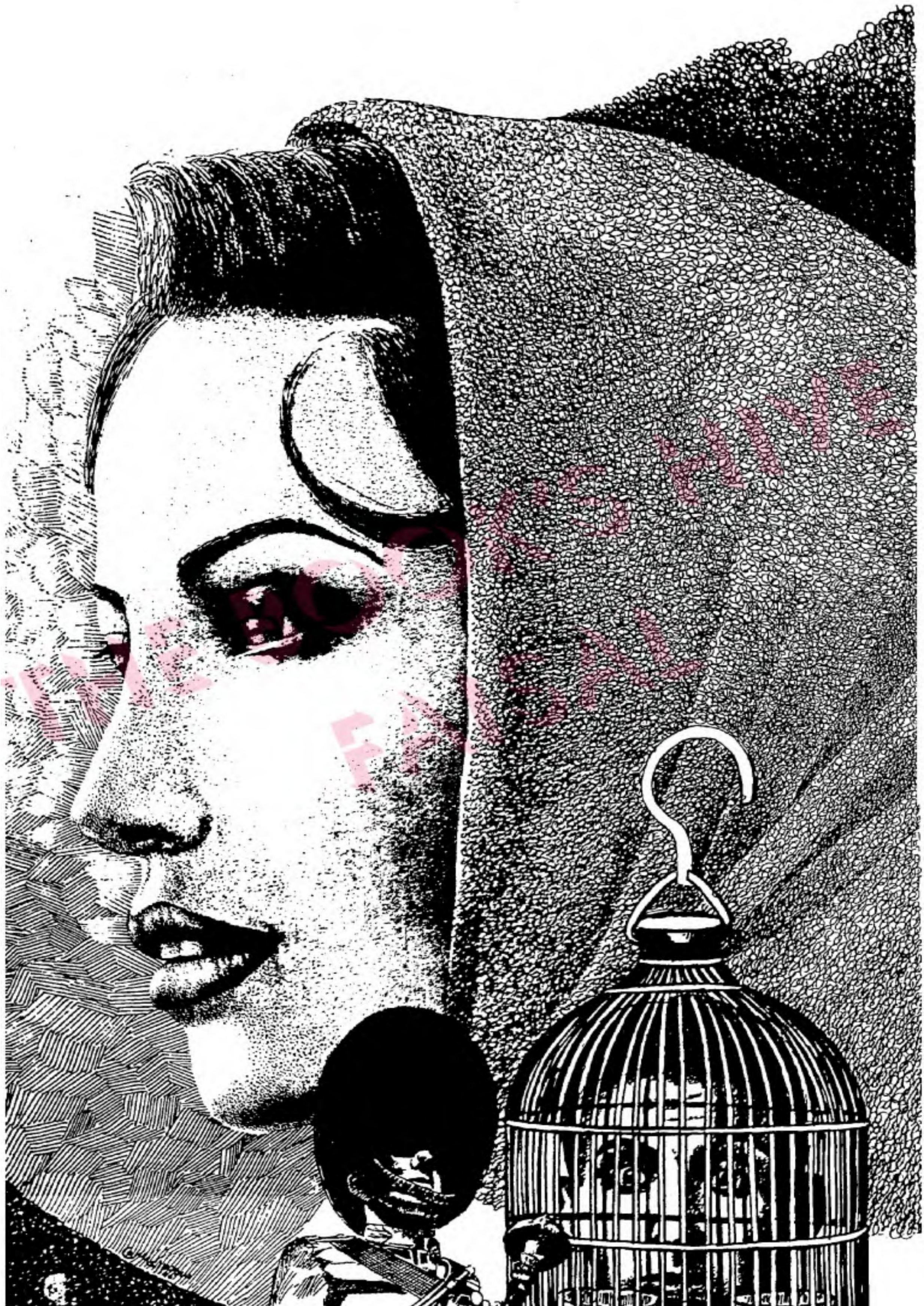

چاپ سنائی دی اور لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی گئی۔ آواز معدوم ہوئی تو پھر گہرا سکوت طاری ہوگیا۔ وہ سب کے سب پتھر کے بتوں کی طرح ساکت بیٹھے رہے اور اپنے کشیدہ اعصاب کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے۔ کوئی دس منٹ انہیں مزید انتظار کی سولی پر لٹکنا پڑا۔ پھر قدموں کی آواز سنائی دی۔ ایک بار پھر دروازہ کھلا اور بند ہوا۔ پھر کسی نے کہا "اوکے رابرٹ۔"

"یس۔" دوسری آواز سنائی دی "ایوری تھنگ از آل رائٹ' برنگ دم ان۔"

"اوکے۔"

پھر قدموں کی آواز ابھری۔ کوئی شخص وین کے عقبی حصے کی طرف گیا۔ پھر انہوں نے چابی گھومنے کی کلک سنی۔ پھر ہینڈل گھوما اور ہلکی سی آواز کے ساتھ وین کا دروازہ کھل گیا۔

سامنے وین کا ڈرائیور کھڑا تھا۔ اس کا نام جان تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے دبی آواز میں کہا "کم ان' بٹ ڈونٹ میک اینی نوائز۔"

علی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ لیکن اتنا سمجھ گیا کہ وہ احتیاط کی ہدایت کررہا ہے۔ پھر وہ باری باری وین سے باہر آئے۔ علی نے زمین پر پاؤں رکھا تو اسے قدم جمانے میں دشواری ہوئی۔ سنبھلنے کے لیے اسے وین کے کھلے دروازے کا سہارا لینا پڑا۔ اس کے پاؤں شل ہوگئے تھے اور سارا جسم اکڑا ہوا تھا۔ اس نے زور زور سے پیروں کو جھٹکا۔ گردن کو دائیں بائیں جنبش دی۔ پھر زور زور سے کئی سانسیں لیں۔ جب جسم میں کچھ جان محسوس ہوئی اور وہ اپنے قدموں پر اچھی طرح کھڑا ہوگیا تو اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ مگر گردوپیش میں تھا کیا؟ ایک پتلی سی ویران گلی تھی۔ دائیں طرف تین منزلہ عمارتوں کی قطار تھی۔ بائیں طرف ایک طویل اونچی دیوار' جو غالباً کسی فیکٹری یا گودام کی تھی۔ دیوار کے اختتام پر ایک دو منزلہ عمارت تھی' اوپر غالباً کمرے تھے اور نیچے یا تو گیراج تھا یا کوئی ورکشاپ' وین اسی عمارت کے سامنے رکی تھی۔ علی نے دیکھا کہ گیراج کے اوپر ایک کمرے کی کھڑکی میں مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ پھر اس کی نظر ان عمارتوں کی طرف گئی جو دائیں جانب تھیں۔ وہ عمارتیں خاصی کہنہ اور خستہ نظر آرہی تھیں اور لگتا تھا کہ ان میں سے اکثر آباد بھی نہیں ہیں۔ کسی بھی عمارت کی کھڑکی میں روشنی نظر نہیں آرہی تھی۔ علی حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ سارے میں ایک عجیب سی ویرانی اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی جو دل پر کپکپی طاری کرتی تھا۔ علی کے دل میں جاگزیں خوف اور وحشت میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی قبرستان میں کھڑا ہے جہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ صرف موت کی ویرانی ہے۔ اسے یہ ویرانی' سناٹا اور سرکاری لیمپ پوسٹ کی زرد' بیمار روشنی اچھی نہیں لگی۔ وہ یکایک آگے بڑھ کر راجا کے پاس چلا گیا۔

"یار' عجیب جگہ ہے یہ۔"

"ہاں۔" راجا نے سرگوشی کی "کتنی خاموشی ہے چاروں طرف۔"

"مجھے تو کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔"

"گھبراؤ مت۔"

پھر وہ رابرٹ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ وہ دبی دبی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا جو ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر اس کے ہاتھ کے اشارے کو دیکھ کر اتنا ضرور سمجھ گئے کہ وہ انہیں عمارت میں چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ گیراج کے دائیں طرف سیڑھیاں تھیں جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سب سے پہلے موہن آگے بڑھا' پھر دوسروں نے تقلید کی۔ علی سب سے پیچھے تھا۔ جب وہ سیڑھیوں کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ تینوں سفید فام جوان کے ساتھ بلجیم سے شامل ہوئے تھے' اور جن کا تعلق غالباً مشرقی یورپ کے کسی ملک سے تھا' عمارت میں جانے کے بجائے واپس وین میں بیٹھ رہے ہیں۔ جب وہ نصف سیڑھیوں پر پہنچا تو اس نے انجن اسٹارٹ ہونے اور وین کے چلنے کی آواز سنی۔ اسے یہ قیاس کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ جان ان تینوں کو کسی اور جگہ لے جارہا تھا۔

انہیں دوسری منزل کے ایک کمرے میں پہنچایا گیا۔ کمرا گو خاصا کشادہ تھا مگر بے حد بے ترتیب اور گندہ تھا۔ ایک طرف ایک کرم خوردہ اور میلا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ شاید چالیس پچاس سال پرانا تھا۔ تین چار کرسیاں بھی تھیں۔ فرش پر جابجا سگریٹ کے ٹوٹے' خالی پیکٹ اور کاغذ کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ مہینوں سے کمرے کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ کمرے کے وسط میں ایک ٹیبل تھی۔ ٹیبل پر شراب کی خالی بوتلیں' ڈبے اور راکھ اور ٹوٹوں سے بھری ہوئی ایک ایش ٹرے اور ایک پلیٹ پڑی تھی جس میں نصف کھایا ہوا باسی کھانا موجود تھا۔ غالباً مچھلی اور آلو کے چپس۔ کمرے میں ایک تیز اور نامانوس بُو بسی ہوئی تھی جو یا تو پرانے صوفے اور میل خوردہ قالین سے اٹھ رہی تھی اور یا پھر شراب کی تھی۔ علی کو وہ بُو اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ مگر اس نے بو کی طرف دھیان نہیں دیا۔ توجہ تو دیواروں کی جانب مبذول ہوگئی تھی جہاں غالباً رنگین رسالوں سے کاٹی گئی عریاں اور نیم عریاں عورتوں کی رنگین تصاویر بے ترتیبی سے چپکی ہوئی تھیں۔ علی ہکا بکا ہو کر انہیں دیکھتا رہا۔ علی نے ننگی تصاویر پہلے بھی چند ایک بار دیکھی تھیں مگر ایسی تصویریں پہلی بار اس کی نظر سے گزری تھیں جو جذبات میں شعلے بھڑکا دیں۔ اس نے اپنے جسم میں ایک تیز سنسناہٹ کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور راجا کی طرف دیکھا۔

راجا کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اس نے آہستہ سے سرگوشی کی "یار کمال ہے۔"

"یہ سامنے والی تصویر دیکھو۔ اس میں تو سالا مرد بھی ننگا کھڑا

ہے۔" علی نے آہستہ سے کہا۔

ایک اچھی بات یہ تھی کہ کمرے میں ایک گیس ہیٹر تھا۔ رابرٹ نے ہیٹر جلایا اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر دروازے کی جانب منہ اٹھا کر کھردری آواز میں چیخا۔

"ٹونی۔"

عمارت کے کسی اور حصے سے ایک تیز چیختی ہوئی نسوانی آواز آئی "کمنگ۔"

دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹونی غالباً اس کا نام تھا۔ وہ کشیدہ قامت اور قدرے فربہ عورت تھی۔ اس نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ ستر پوشی تو بالکل نہیں کر رہا تھا۔ ہاں اس کے جسم کے دلکش نشیب و فراز کو ہیجان انگیز طور پر نمایاں ضرور کر رہا تھا۔ اس کا اسکرٹ بے حد مختصر تھا اتنا کہ اس کی سیاہ انڈرویئر کے کنارے صاف نظر آ رہے تھے۔ اسکرٹ کے اوپر سرخ رنگ کی ایک بنیان تھی۔ جس پر لفظ HELL سیاہ رنگ سے چھپا ہوا تھا۔ بنیان کا گلا اتنا کشادہ تھا کہ اس کا سینہ نصف کے قریب صاف نظر آ رہا تھا۔ مگر ٹونی کے انداز سے ایسا کوئی اشارہ نہیں مل رہا تھا کہ اسے اپنے جسم کی ضرورت سے زیادہ عریانی کا کوئی احساس بھی ہے۔ اس کے سنہری بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک کی دبیز تہ تھی جو قدرے پھیل گئی تھی اور اس کے ہونٹوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی کسی کا خون چوس کر آئی ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں شراب کا ٹن اور دوسرے میں سلگتی ہوئی سگریٹ تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے ایک طائرانہ نظر ان ساتوں پر ڈالی۔ پھر کش لے کر رابرٹ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"سو دے آر ہیئر۔"

"یس۔" رابرٹ نے آگے بڑھ کر بے تکلفی سے ٹونی کے ہونٹ چومے۔ پھر اس کے ہاتھ سے شراب کا ٹن لے کر ایک گھونٹ بھرا "ڈیوڈ کہاں ہے؟"

"گاڑی لینے گیا ہے۔ ابھی آ جائے گا۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"اچھا خیر' ان لوگوں کے لیے چائے لاؤ اور کچھ کھانے کو بھی۔"

"اوکے۔" ٹونی گھوم کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

رابرٹ نے ایک سگریٹ جلائی۔ پھر ایک تفکر آمیز نظر ان سب پر ڈالی اور دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ ساتوں اس کی جانب متوجہ تھے اور منتظر تھے کہ اب وہ کیا ہدایت دے گا۔ رابرٹ کچھ دیر سوچتا رہا پھر سر ہلا کر کہنے لگا "تمہارا سفر ختم ہوا۔ اب تم لوگ انگلینڈ میں ہو۔ یہ جگہ جہاں اس وقت تم لوگ ہو' لندن کے مضافات میں ہے۔ تم میں سے تین افراد کو یہیں لندن میں اپنے ٹھکانوں پر جانا ہے۔ جبکہ چار کو مڈلینڈ اور لنکا شائر کی طرف جانا ہے۔ تم لوگ یہاں آرام سے بیٹھو' چائے پیو اور کچھ کھالو۔ ابھی جان اور ڈیوڈ آئیں

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات
ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت ۱۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

عظمت کے مینار
ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت ۱۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی ۱۰ معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ فن پارے' جن کی آپ کو تلاش ہے۔
قیمت ۱۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

پچھا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے
قیمت ۱۰۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول اس لوگوں کے لیے ایک تازیانہ جو بیگانگی کے لبادے میں اپنا اصل چہرہ چھپا کر رکھتے ہیں
قیمت ۲۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

کالی کہانیاں
جرائم' مہلک شیطان' ازم' ارواح' طنز و مزاح' اسرار و خوف' سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں
قیمت ۳۰ روپے ڈاک خرچ ۱۶ روپے

نک ویلوٹ کی چوریاں
خوبصورت نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گراں قدر معاوضے پر چرساتا ہے۔
قیمت جلد اول بہ جلد دوم ہر ۴۰
ڈاک خرچ فی جلد ۱۶ روپے

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس ۲۳ سعید منزل بلیموریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

گے تو تم سب کو تمہارے ٹھکانوں پر پہنچانے کا بندوبست کیا جائے گا۔ اس کے بعد..." اس نے رک کر کش لیا اور غور سے انہیں دیکھا "اس کے بعد ہماری ذمے داری ختم ہو جائے گی۔ سمجھ گئے تم لوگ..."

وہ سب چپ رہے۔

قدرے توقف کے بعد اس نے پھر کہا "ایک بات اور تمہیں بتانا ضروری ہے۔ اور وہ ہے احتیاط' پوری احتیاط۔ کبھی کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا کہ تم لوگ کس طرح اس ملک میں آئے ہو۔ جہاں تک ہو سکے اس بات کو چھپانا۔ غیر ضروری مقامات پر کھلے عام گھومنا پھرنا مت اور پولیس سے ہر حال میں بچنے کی کوشش کرنا۔ اتنا یاد رکھنا کہ کبھی کہیں تم نے ذرا سی بھی بھول کی تو دھر لیے جاؤ گے۔ پہلے سزا ہوگی' اس کے بعد جہاز میں بٹھا کر واپس بھیج دیئے جاؤ گے۔"

رابرٹ چپ ہو گیا اور چند لمحے گہری نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر یکایک گھوما اور باہر چلا گیا۔

علی نے تجسس آمیز نظروں سے راجا کو دیکھا۔ کیونکہ رابرٹ نے پوری بات انگریزی میں کی تھی اور اس کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ راجا کا حال بھی مختلف نہیں تھا۔ انگریزی سے وہ بھی اتنا ہی نابلد تھا' جتنا علی۔ چنانچہ انہوں نے متوقع نظروں سے الطاف کی طرف دیکھا۔ ان ساتوں میں ایک الطاف ہی ایسا تھا جو انگریزی سے اچھی خاصی واقفیت رکھتا تھا۔ ان کے استفسار پر اس نے رابرٹ کی مختصر سی تقریر کا خلاصہ بیان کیا۔

علی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے حلق میں کوئی ہڈی پھنس گئی ہو۔

انتظار کے لمحات بڑے جاں گسل تھے۔ ہر چند کہ کمرے میں ہیٹر جلنے کے باعث سردی اور گھٹن میں کمی ہو گئی تھی۔ مگر ہیٹر کی آنچ دل میں اٹھنے والے اندیشوں اور خوف کو تو کم نہیں کر سکتی تھی۔ ہر گزرتا پل ان کے اضطراب اور خوف میں اضافہ کر رہا تھا۔ بے یقینی اور شک کو مزید بڑھا رہا تھا۔ خاص طور پر علی کی ذہنی حالت دگرگوں تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دماغ میں اَن گنت کھنکھجورے کلبلا رہے ہوں اور بار بار اپنے نکیلے پنجوں سے اس کے دماغ کو کھرچ رہے ہوں۔ اب کیا ہوگا؟ آگے کیا ہوگا؟ ستائیس دن ہوئے جب وہ اپنے شہر سے چلا تھا۔ ان ستائیس دنوں میں اس نے بڑی صعوبتیں جھیلی تھیں۔ اَن گنت عذابوں سے گزرا تھا۔ اور ایک مسلسل ذہنی اذیت برداشت کی تھی۔ اس کا یہ سفر ایسا ہی تھا جیسے کوئی جلتی ہوئی ریت کے صحرا میں ننگے پاؤں چلے۔ مگر وہ سفر بہرحال اب تمام ہو گیا تھا اور خطرات اور مشکلات کے آتشیں صحرا سے گزر کر وہ لندن پہنچ گیا تھا۔ اب لندن کے ایک نواحی علاقے میں کہیں موجود تھا۔ لندن' پاؤنڈ اسٹرلنگ کا دیس۔ جہاں کہتے ہیں کہ مٹی بھی سونا بن جاتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اب کیا ہوگا۔ وہ کیا کرے گا؟ کہاں جائے گا۔ اس نے نظر بھر کر راجا' الطاف' جوگندر اور موہن چوپڑہ کی طرف دیکھا۔ باقی دو افراد کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا۔ کیونکہ وہ سیلونی تھے اور اردو میں ٹھیک سے گفتگو نہیں کر پاتے تھے۔ ویسے بھی وہ دونوں الگ تھلگ ہی رہتے تھے۔ لہٰذا ان سے کسی قسم کی مدد کی توقع کرنا فضول ہی تھا۔ مدد اگر مل سکتی تھی تو راجا یا جوگندر سے۔ مگر وہ کس سے اپنی مشکل بیان کرے۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ان چاروں کے اپنے ٹھکانے تھے جہاں انہیں جانا تھا۔ کسی کا کوئی رشتے دار انگلستان میں تھا تو کسی کا کوئی واقف یا دوست۔ جبکہ علی کا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ تو انگلینڈ میں کسی کو جانتا تک نہیں تھا۔ تو پھر وہ کہاں جائے گا۔ کیا کرے گا؟ اس اجنبی دیس میں جہاں کا چپہ چپہ' گلی گلی انجانی ہے۔ زبان اور چہرے اجنبی ہیں' وہ کیا کرے گا۔ کیسے اور کہاں اپنا ٹھکانا بنائے گا۔ یہ خیال بے حد لرزہ خیز تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ منزل پر پہنچ کر بھی منزل پر نہیں پہنچا ہے۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور ٹونی اندر داخل ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر اپنی لمبی سڈول ٹانگوں کی نمائش کی' ان کی طرف دیکھ کر بے تکلفی سے مسکرائی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ ٹرے میز پر رکھ کر واپس چلی گئی۔

ٹرے میں چائے کے سات مگ تھے اور بریڈ کے سلائس۔ دوسروں کی طرح علی نے بھی ایک مگ اٹھایا اور گرم گرم چائے کا بڑا گھونٹ بھرا۔ گرم چائے حلق سے نیچے ہوتی ہوئی سینے تک پہنچی تو اسے گرمی کا احساس ہوا۔ یوں جیسے اس کے جسم میں' زندگی ایک بار پھر انگڑائی لے کر بیدار ہوئی ہو۔ اس نے دو تین گھونٹ جلدی جلدی لیے۔ چائے گو اچھی نہیں تھی بلکہ قدرے بدمزہ تھی مگر اس وقت شدید سردی' بھوک اور ذہنی درماندگی کے عالم میں وہ چائے اسے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم محسوس نہیں ہوئی۔ ہر چسکی راحت افزا اور زندگی افروز لگی۔ ذہن کو ذرا سکون کا احساس ہوا تو اس نے جیب سے بلجنین سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ ایک سگریٹ جلائی۔ پھر ایک طویل کش لے کر راجا کی طرف دیکھا۔

"راجا بھائی' ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"یہاں نہیں۔" اس نے آواز دبا کر کہا "چلئے اس کونے میں چلتے ہیں۔"

"کیوں؟ ایسی کیا بات ہے؟" راجا نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"چلئے تو' ضروری بات ہے۔"

انہوں نے کرسیاں اٹھائیں اور کمرے کے قدرے الگ تھلگ کونے میں جا بیٹھے۔ جب علی کو اطمینان ہو گیا کہ کوئی اور ان کی طرف متوجہ نہیں ہے تو اس نے آہستہ سے کہا "اصل میں بات

یہ ہے راجا بھائی کہ میں ذرا مشکل میں ہوں۔"

"کیا بات ہے؟" راجا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

علی ایک بار پھر شش و پنج میں پڑ گیا۔ کہے نہ کہے' اور اگر کہے تو کس طرح اپنا مدعا بیان کرے۔ کبھی کبھی مناسب اور موزوں الفاظ کا انتخاب ایک مشکل مرحلہ بن جاتا ہے۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے یکایک کہا "راجا بھائی' آپ کہاں جائیں گے۔ میرا مطلب ہے کس شہر میں؟"

"یار لنکا شائر میں راچڈیل نام کا ایک شہر ہے۔ میں وہیں جاؤں گا۔"

"وہاں آپ کا کوئی رشتے دار ہے۔"

راجا ذرا افسردگی سے مسکرایا "بھائی سچ پوچھو تو میرا اس ملک میں نہ کوئی عزیز ہے نہ دوست۔ میں تو کسی کو جانتا تک نہیں۔ وہاں راچڈیل میں ایک صاحب ہیں بشیر احمد' میرے ایک چچا سے ان کی کچھ واقفیت ہے۔ میں انہی کے نام ایک چٹھی لایا ہوں۔ امید ہے کہ وہ ضرور مدد کریں گے۔ مگر تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

علی نے چائے کی چسکی لی پھر پژمردگی سے بولا "میرا حال بھی وہی ہے جو ابھی آپ نے بیان کیا تھا۔ یعنی اس ملک میں میں بالکل اجنبی ہوں۔ میرے پاس تو کسی کے نام کوئی چٹھی تک نہیں ہے۔ پھر میں کیا کروں گا۔ ساحل پر بوٹ سے اترنے کے بعد سے میں مسلسل اس الجھن میں گھرا ہوا ہوں۔"

"تو پھر؟"

علی نے امید بھری نظروں سے راجا کو دیکھا "کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟"

راجا نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا "تمہارا مطلب ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلنا چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ہم دونوں کا حال تو ایک جیسا ہے۔ ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کے کام نہیں آئیں گے تو کون ہماری مدد کرے گا۔ تم بخوشی میرے ساتھ چلو۔ جو کچھ ہوگا' دیکھا جائے گا یا تو دونوں کا کام بنے گا' یا پھر دونوں ہی ڈوبیں گے۔"

علی کو یکایک یوں محسوس ہوا جیسے ڈوبتے ڈوبتے اچانک اسے تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔ ایک تنہا' اور بے یار و مددگار آدمی کے لیے ہمدردی کے دو بول یا سہارے کی خفیف سی امید اس ستارے کے مانند ہوتی ہے جو سیاہ راتوں میں مسافر کو راستہ دکھاتا ہے۔ ابھی تک وہ مایوسی اور تفکر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھرا ہوا تھا۔ مگر راجا کے حوصلہ افزا الفاظ نے اس اندھیرے میں یکایک امید کا جگنو روشن کر دیا۔ اس نے مگ زمین پر رکھ کر راجا کا ہاتھ تھام لیا اور تشکر آمیز لہجے میں بولا "شکریہ راجا بھائی۔"

"کوئی بات نہیں یار۔ ہم تم الگ الگ تھوڑے ہی ہیں۔" راجا نے مسکرا کر کہا۔

دو گھنٹے انہیں مزید انتظار کرنا پڑا۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ دو گھنٹے انہیں دو صدیوں کے برابر محسوس ہوئے۔ پھر جان واپس آیا۔ اس کے ساتھ رابرٹ بھی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اب ان کے سفر کا اگلا مرحلہ شروع ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جان دونوں سیلونوں اور الطاف کو لے کر چلا گیا۔ کیونکہ ان تینوں کو لندن یا اس کے گرد و نواح میں کہیں جانا تھا۔ اب علی' راجا' موہن اور جوگندر رہ گئے تھے۔ رابرٹ نے انہیں اطلاع دی کہ کچھ دیر میں ڈیوڈ بھی آجائے گا تب ان کے سفر کا انتظام ہوگا۔ تب تک وہ آرام سے بیٹھیں اور ذرا بھی فکر مند نہ ہوں۔ پھر وہ سیٹی پر کوئی انگریزی دُھن الاپتا ہوا مکان کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

لیکن ڈیوڈ کی آمد تھوڑی دیر میں نہیں پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی۔ نام کی بنا پر ان کا خیال تھا کہ رابرٹ اور جان کی طرح ڈیوڈ بھی کوئی سفید فام شخص ہوگا۔ مگر یہ خیال غلط نکلا۔ ڈیوڈ ایشین تھا اور جنوبی ہندوستان کے کسی علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا' جسم فربہ' سر پر بال برائے نام' آنکھوں میں سرخی رچی ہوئی تھی جو غالباً کثرتِ شراب نوشی کا نتیجہ تھی۔ جب اس نے زبان کھولی تو منکشف ہوا کہ اس وقت بھی وہ خاصے نشے میں تھا۔ ٹونی بھی اس کے ساتھ ہی کمرے میں آئی تھی۔ ڈیوڈ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال رکھا تھا' شاید سہارا لینے کے لیے۔ اور ٹونی کے انداز سے ایسا نہیں محسوس ہوتا تھا کہ اسے اس بات پر کوئی اعتراض ہے۔

"ہیلو۔" کمرے کے وسط میں پہنچ کر ڈیوڈ نے اونچی آواز میں کہا "ایورنی تھنگ ٹھیک ہے نا؟"

وہ چاروں چپ رہے۔

ڈیوڈ کا اصل نام دیوندر تھا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں انگریزی آمیز ہندوستانی بولتا تھا۔ اس نے ٹونی کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر ایک کش لیا پھر کہنے لگا "سوری' میرے کو آنے میں دیر ہوا۔ ابھی آدھی رات کا ٹیم ہو گیا ہے اور تم لوگوں کو دور جانا ہے۔ ابھی جرنی کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ تم لوگ یہیں ریسٹ کرو۔ کل ایوننگ میں چلے گا۔ تم کوئی بات کا وری مت کرو۔ نو ڈینجر واٹ سو ایور' بٹ بی کیئر فل۔ اوکے۔"

"لیکن آج کیوں نہیں جا سکتے؟" دفعتاً موہن نے پوچھا۔

ڈیوڈ نے ٹونی کی کمر تھپتھپائی "ابھی چلے گا تو ادھر دن میں پہنچے گا۔ ڈے لائٹ میں کھترا ہے۔ نائٹ میں ٹریول کرنا ٹھیک ہے۔" ڈیوڈ نے توقف کیا پھر کہنے لگا "ابھی ٹونی تم کو چائے اور سینڈوچ دے گا۔ کھا پی کر سو جاؤ۔ گھبرانے کا کوئی بات نہیں۔ کل ایوننگ میں چلے گا۔ اوکے!"

پھر وہ دونوں چلے گئے۔

انہیں چائے' سینڈوچ اور کمبل دیئے گئے۔ راجا اور علی نے صرف چائے پر اکتفا کیا۔ سینڈوچز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ پھر وہ

سونے کے لئے لیٹ گئے لیکن نیند شاید کسی کو بھی نہیں آئی۔ ایک طرف تو سردی گھیرے ہوئی تھی' باوجود اس کے کہ کمرا خاصا گرم تھا اور دوسری طرف دل و دماغ خوف اور اندیشوں کے گرداب میں پھنسے ہوئے تھے۔ ایک اجنبی سرزمین' انجان لوگ اور اگلا ہر پل سوالیہ نشان کی سولی پر لٹکا ہوا۔ ان حالات میں بھلا نیند کیسے اور کسے آتی ہے۔ علی کو بھی نہیں آئی۔ وہ دیر تک کمبل میں لپٹا ہوا پڑا رہا اور گزرتے لمحوں کی چاپ سنتا رہا۔ پھر وحشت نے آگھیرا' بے کلی بڑھ گئی۔ اس نے کمبل سے منہ نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور گہرا سکوت۔ موہن اور جوگندر ہیٹر کے قریب قالین پر پڑے تھے اور غالباً سو ہی گئے تھے۔ راجا صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ علی چند لمحے انہیں دیکھتا رہا پھر چپکے سے اٹھا اور عقبی کھڑکی کے پاس گیا۔ ایک کرسی وہاں پڑی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ باہر دور تک ایک مدھم دھندلکا پھیلا ہوا تھا۔ اور ساری فضا ایک گہرے' پراسرار اور سحر آمیز سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ درختوں کے ہیولے اور ننھی ننھی ٹمٹماتی روشنیاں' اور عمارتیں۔ اوپر آسمان گہرے سرمئی بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا یہ منظر کسی خواب کا حصہ لگتا تھا۔ یوں' جیسے ہے' پر نہیں ہے۔ علی اک عالمِ خود فراموشی میں پیڑوں کو' روشنیوں کو اور عمارتوں کو دیکھتا رہا۔ کچھ ایسی بے یقینی کے انداز میں' جیسے وہ سارے مظاہر' وہ پورا منظر صرف ایک گمان ہو۔ محض ایک فریبِ نظر' اسے تو اس وقت اپنے ہونے پر بھی شبہ تھا۔ کیا وہ واقعی ہے اور کیا واقعی وہ اس وقت' رات کے اس پہر' لندن کے مضافات میں واقع اس عمارت میں موجود ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ پورا منظر اور اس کے مشتملات مع اس کے' کسی اَن دیکھی' اَن جانی مگر عظیم ترین ہستی کے تصور کا سرچشمہ ہوں۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سر اٹھا کر بادلوں سے ڈھکے آسمان کو دیکھا۔

یکایک اسے اپنے قریب آہٹ کا احساس ہوا۔

اس نے گردن گھمائی تو دیکھا کہ راجا قریب کھڑا ہے۔

"کیا نیند نہیں آرہی؟" راجا نے ایک کرسی گھسیٹی اور خود بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"نہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا "کوشش تو کی تھی۔ پر نیند نہیں آئی۔"

"سگریٹ پیو گے۔"

انہوں نے سگریٹ جلائی۔ پھر راجا نے کہا "علی' کیا سوچ رہے تھے؟"

علی نے گردن گھما کر راجا کو دیکھا۔ پھر افسردہ آواز میں بولا۔

"راجا بھائی' ذرا یہ باہر کا منظر دیکھو۔"

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔" راجا نے حدِ نظر تک پھیلی ہوئی وسعتوں میں نظر ڈالی "کچھ عجیب ہی منظر ہے۔ سویا سویا' کوئی بھی چیز واضح نہیں ہے۔ بلکہ ہر شے' درختوں کے جھنڈ اور روشنیاں اور عمارتیں دھبوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ جیسے کوئی بہت بڑی تصویر ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے....."

"لینڈ اسکیپ۔" علی نے کہا "ایک عظیم الشان لینڈ اسکیپ اور وہ بھی واٹر کلرز میں ۔ کیا اس منظر کو دیکھ کر دل میں ایک بے ثباتی کا احساس پیدا نہیں ہوتا؟"

"کیا مطلب؟"

"یار پتا نہیں۔" علی نے آہستہ سے کہا "مجھے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے' جیسے یہ سب کچھ جو ہمارے اردگرد ہے' بس ایک خیال ہے' اور کچھ نہیں۔"

"یار میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کہیں تم شاعری وائری تو نہیں کرتے۔"

علی ہنسنے لگا "نہیں' میں شاعری نہیں کرتا' ہاں پڑھتا ضرور ہوں۔"

دونوں کچھ دیر چپ رہے اور اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے رہے۔ پھر راجا نے یکایک کہا "علی ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

راجا چند لمحے پُرخیال نظروں سے خلا میں گھورتا رہا پھر سر ہلا کر بولا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

علی نے چونک کر اسے گھورا "تمہارا مطلب ہے' یہاں انگلینڈ؟"

"ہاں۔"

سوال اچانک بھی تھا اور غیر متوقع بھی۔ علی طے نہ کرسکا' کیا کہے۔ کچھ دیر الجھی ہوئی نظروں سے راجا کو دیکھتا رہا پھر بولا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"یار سچ پوچھو تو مجھے پتا نہیں۔" راجا نے اس طرح جواب دیا جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو "بس ایک شوق تھا' ایک جنون۔ میں ہر حال میں برطانیہ آنا چاہتا تھا۔ شاید ترغیب مجھے ان لوگوں سے ملی ہو' جو میرے علاقے میں رہتے ہیں۔ میں جس گاؤں سے آیا ہوں' اسے تم ایک چھوٹا سا شہر سمجھو۔ وہاں مشکل سے چند ہی خاندان ایسے ہوں گے جن کا کوئی آدمی برطانیہ' جرمنی یا امریکا وغیرہ میں نہ ہو۔ اس کے علاوہ جب بیرونی ممالک میں آباد یہ لوگ کچھ دن کے لیے وطن آتے ہیں تو ان کا انداز بڑا نمائشی ہوتا ہے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ چلتے ہیں تو اترا اترا کر اور پیسہ یوں خرچ کرتے ہیں گویا پانی میں بہا رہے ہوں۔ ان کی عورتیں زرق برق کپڑے پہنے رہتی ہیں اور زیوروں سے ہر وقت لدی پھندی۔ ان کی زبان پر ہر وقت پاؤنڈ اور ڈالر کا ذکر رہتا ہے۔ اور تقریباً ہر ایک کا دعویٰ ہوتا ہے کہ اس کے پاس ہنڈا' مرسڈیز یا جیگور کے علاوہ بھی ایک یا دو کاریں ہیں۔ میرے محلے کا ایک آدمی ہے جس سے بہت دور کی برائے نام رشتے داری بھی ہے' وہ ڈنمارک میں رہتا ہے۔ اس نے

ایک بار مجھ سے کہا تھا "بھائی ایک کار میں مزہ نہیں آتا۔ اسی لیے میں نے تین کاریں رکھی ہوئی ہیں تاکہ بدل بدل کر استعمال کروں۔ ایک ہی کار میں بار بار بیٹھو تو طبیعت اکتا جاتی ہے۔" ایک اور اہم بات یہ ہے کہ باہر رہنے والے ان تمام لوگوں کے پاس عالی شان مکان یا بنگلے ہوتے ہیں۔ جن کی مالیت ڈیڑھ دو کروڑ سے کم نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی ان کے بڑے بڑے کاروبار ہوتے ہیں اور کئی ملازم جو کاروبار کو چلاتے ہیں...." راجا یکایک چپ ہوگیا۔

چند لمحے بعد راجا نے کہا "شاید یہ احساسِ کمتری ہے' کم مائیگی اور بے وقعتی کہ باہر سے آنے والوں کی باتیں سن سن کر میرے دل میں بھی باہر جانے کا جنون پیدا ہوا۔ شاید میرے ذہن میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ مرسڈیز میں سفر کروں۔ بنگلے میں رہوں اور پلاسٹک کارڈ سے چیزیں خریدوں اور جب کبھی وطن جاؤں تو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دوں۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا' بس ایسا محسوس کرتا ہوں کہ باہر سے آنے والوں نے میرے ذہن میں اس خواہش کو ہوا دی ہے۔ شاید یہ بھی کہ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں' اس میں کتنا سچ ہے۔ پہلے میں نے جائز طریقے سے کوشش کی۔ سفارت خانوں کے چکر کاٹے۔ درخواستیں اور خطوط لکھے۔ مگر بات نہیں بنی۔ پھر میں نے یہ راستہ اختیار کیا۔ بیوی کے زیور بیچے اور...." وہ معاً پھر چپ ہوگیا۔

کچھ دیر ایک بوجھل اور اعصاب شکن سکوت طاری رہا۔

"مجھے پتا نہیں جو کچھ میں نے کیا ہے' وہ درست ہے یا غلط۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔" راجا نے ایک اور سگریٹ نکالی "خیر تم سناؤ' یہاں آنے کا فیصلہ تم نے کیوں کیا؟"

"یار راجا بھائی' شاید ہم سب کی کہانی ایک ہی ہے۔ کچھ باہر کے بارے میں افسانوی قصے اور کچھ اپنے حالات۔" علی نے سگریٹ جلائی "میرے ابا نہیں ہیں۔ بوڑھی اماں ہیں اور ایک خالہ جو بیوہ اور بے اولاد ہیں اور ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ تین چھوٹی بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ ان سب کی ذمے داری میرے اوپر ہے۔ میں ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ مگر شب و روز کی کڑی مشقت کے باوجود دال روٹی بھی مشکل سے چلتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں' کہاں جاؤں؟ آگے کیا ہوگا؟ بھائی کی تعلیم کیسے پوری ہوگی اور بہنوں کی شادیاں کیسے ہوں گی۔ جب بات کسی طرح بنتی نظر نہ آئی تو باہر آنے کا فیصلہ کیا۔ تمہاری طرح میں نے بھی باہر سے آنے والوں کو دیکھا تھا۔ ان کی باتیں سنی تھیں۔ ان کے کپڑے' زیور' گھڑیاں اور پلاسٹک کارڈ دیکھے تھے۔ میں نے سوچا کہ میرے مسائل کا حل بھی "باہر" ہی ہے۔ ایک بار باہر چلا جاؤں تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ عسرت کا سیاہ سورج ڈوب جائے گا اور ہمارے نصیب میں بھی خوشی اور سکون کی دو چار کرنیں آجائیں گی۔ میرا بھائی پڑھ لکھ کر کسی قابل بن جائے گا اور بہنوں کے گھر آباد ہو جائیں گے۔ تمہاری طرح پہلے میں نے بھی سفارت خانوں کے چکر کاٹے۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی تو یہ راستہ اختیار کیا جو خطرات اور بے یقینی سے پُر ہے۔ میں یہاں روشنی کی تلاش میں آیا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مجھے کیا ملتا ہے۔ روشنی یا....." وہ طویل سانس لے کر چپ ہوگیا۔

راجا نے ذرا حیرت سے کہا "مگر یار تمہاری اماں اور بہن بھائی کیا کریں گے؟"

"کیا مطلب؟" علی نے حیرت سے پوچھا۔

"یار ابھی تم نے کہا تھا کہ گھر کی کفالت تم ہی کرتے تھے۔ مگر اب تم یہاں ہو تو ان کی ضروریات کیسے پوری ہوں گی؟"

علی نے مسکرا کر کہا "انشاء اللہ انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ میں نے ان کے اخراجات کا معقول بندوبست کردیا ہے۔ پھر یہاں جیسے ہی مجھے نوکری ملے گی' میں ... انہیں روپیہ بھیجنا شروع کردوں گا۔"

پھر وہ دونوں چپ ہوگئے اور گمشدہ نظروں سے باہر دور تک پھیلے آسمان کو دیکھتے رہے۔ شاید ان کی آنکھیں روشنی کی کوئی رمق یا کوئی روشن ستارہ تلاش کررہی تھیں۔

مگر آسمان پر کوئی ستارہ نہیں تھا۔ روشنی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہاں تو گہرے بادل تھے جو لحظہ بہ لحظہ زیادہ دبیز اور سیاہ ہوتے جارہے تھے۔

○☆○

ان کا سفر شام کو چھ بجے شروع ہوا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ دن کا اجالا چار بجے ہی رخصت ہو جاتا تھا۔ چھ بجتے بجتے بالکل اندھیرا ہوگیا۔ ان کی وین مختلف پُر پیچ راستوں سے گزرتی ہوئی موٹروے اے فور او سکس پر آئی۔ پھر ایم الیون سے گزر کر ایم ٹوئنٹی فائیو پر دوڑنے لگی۔ وہ چاروں وین کے اندر بیٹھے تھے۔ وین کے عقبی دروازے میں دو چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں۔ مگر ان کا شیشہ زرد اور اتنا میلا تھا کہ باہر کا منظر صاف نظر نہیں آتا تھا۔ مگر اتنا بہرحال وہ دیکھ سکتے تھے کہ ان کی وین ایک کشادہ اور خوب صورت سڑک سے گزر رہی ہے۔ سڑک دو رویہ تھی۔ ایک حصہ صرف آنے کے لیے اور دوسرا جانے کے لیے۔ سڑک کے دونوں ہی حصوں میں آتی جاتی کاروں کا تار بندھا ہوا تھا۔ چمکتی دمکتی کاریں' ٹرک اور بسیں' چونکہ موٹر ویز پر ٹریفک لائٹس نہیں ہوتیں' لہٰذا کاروں کو رکنا نہیں پڑتا۔ ٹریفک ساٹھ ستر کی رفتار سے مسلسل چلتا رہتا ہے۔ ان کی وین بھی مسلسل دوڑتی رہی۔ علی کھڑکی کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور بار بار باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وین ایک سرنگ سے گزری۔ سرنگ خاصی طویل تھی اور روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ علی نے اپنے ملک کی شکستہ' ناہموار اور گرد آلود سڑکیں دیکھی تھیں جن پر سفر کرنا جان ہتھیلی پر رکھنے کے مترادف تھا۔ لیکن اب وہ برطانیہ کی ایک سڑک دیکھ رہا تھا۔ جو کشادہ اور پُرشکوہ تھی اور اتنی صاف کہ کہیں تنکا بھی

نظر نہیں آتا تھا' ساتھ ہی اتنی ہموار بھی کہ اگر کوئی دھچکا کسی وقت لگتا بھی تو ان کے ٹائروں اور اسپرنگ کی خرابی کی بنا پر۔ اور پھر وہ سرنگ' طویل اور روشن۔ علی کو وہ سرنگ بہت اچھی لگی۔ اس نے یکایک راجا کو متوجہ کیا۔

"یار راجا' یہ سرنگ دیکھی؟"

"ہاں یار' سرنگ بھی اور سڑک بھی۔ کتنی آراستہ اور خوب صورت ہے۔"

"میں نے انگلینڈ کے ہائی ویز کے بارے میں سنا بہت تھا' آج دیکھ بھی لیا۔"

"یہ لوگ سڑکیں بہت اعلیٰ بناتے ہیں۔" راجا نے تبصرہ کیا۔

"خیر ایسی سڑکیں بنا تو ہم بھی سکتے ہیں۔" علی نے گمبھیر لہجے میں کہا "اگر بنانا چاہیں تو....."

سرنگ ختم ہوئی۔ پھر ایم ٹو' ٹنٹی فائیو بھی اختتام کو پہنچی۔ اور وین ایم ون میں داخل ہوئی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ڈیوڈ بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ٹونی بھی تھی۔ ڈیوڈ نے بلند آواز سے انہیں بتایا کہ اب وہ ایم ون پر سفر کر رہے ہیں جو یارک شائر تک جاتی ہے۔ اس نے انہیں یہ بھی بتایا کہ پہلے وہ یارک شائر جائے گا' کیونکہ موہن اور جوگندر کو لیڈز جانا تھا۔ انہیں لیڈز میں چھوڑ کر پھر وہ لنکا شائر کا رخ کرے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ آرام سے بیٹھیں اور کسی بات کے لیے فکر مند نہ ہوں۔

"راچڈیل کب تک پہنچیں گے؟" یکایک راجا نے پوچھا۔

"بارہ ایک تو بج جائے گا۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔

تین گھنٹے مسلسل سفر کرنے کے بعد آخر کار ان کی وین ویلکم بریک نام کے ایک ہوٹل یا کیفے پر رکی جو عام طور پر سروس کہلاتا ہے۔ ہوٹل میں انہوں نے آلو کے چپس کھائے اور چائے پی۔ اور سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا۔ شدید سردی کی بنا پر اور بند وین میں مسلسل تین گھنٹے تک بیٹھے رہنے کے باعث ان کے جسم اکڑ گئے تھے۔ ہاتھ پیر یخ ہو کر تقریباً سن ہو گئے تھے۔ گرم گرم چائے کے بڑے کپ سے انہیں واقعی بڑی راحت ملی۔ یوں لگا جیسے جسم میں زندگی عود کر آئی ہو۔ سگریٹ نے مزید فرحت اور توانائی کا احساس عطا کیا۔ علی کھڑکی کے پاس بیٹھا دھندلے شیشے سے باہر دیکھتا رہا۔ وین ایم ون پر ستر میل کی رفتار سے دوڑتی رہی اور فاصلہ لمحہ بہ لمحہ طے ہوتا رہا۔

مزید ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد آخر کار وہ لیڈز پہنچ گئے۔ ڈیوڈ نے پہلے موہن کو اور پھر جوگندر کو ان کے مطلوبہ پتوں پر چھوڑا۔ جوگندر نے رخصت ہونے سے پہلے ان سے ہاتھ ملایا' ان کے ساتھ کئی دن گزارنے پر خوشی کا اظہار کیا اور توقع ظاہر کی کہ انہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ساتھ ہی اس نے راجا سے وہ پتا بھی لے لیا جہاں راجا اور علی کو جانا تھا۔ اور وعدہ کیا کہ جب بھی موقع ملا وہ ان سے ملنے راچڈیل ضرور آئے گا۔

ایک بار پھر سفر شروع ہوا۔

راچڈیل پہنچے تو رات کا ایک بج چکا تھا۔ سارا شہر سکوت اور ویرانی کی گود میں دفن تھا۔ سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ کہیں کہیں فٹ پاتھوں پر کچھ لوگ آتے جاتے نظر آجاتے تھے۔ جوان لڑکیاں اور لڑکے جو غالباً شراب خانوں اور کلبوں کے بند ہونے کے بعد اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ ڈیوڈ کو وہ گلی تلاش کرنے میں خاصی دشواری ہوئی جہاں راجا کو جانا تھا۔ وہ ایک ویران سی اسٹریٹ تھی۔ دونوں جانب کہنہ اور خستہ مکانات تھے۔ زیادہ تر دو منزلہ لیکن چند ایک مکان تین منزلہ بھی نظر آئے۔ گلی کے وسط میں ایک لیمپ پوسٹ تھا۔ جس میں ایک زرد بلب یوں جل رہا تھا جیسے خود اپنے نصیب پر رو رہا ہو۔ گلی کی خستگی' ویرانی اور کہنگی کو بلب کی پیلی' بیمار روشنی نے کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کہیں زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ کہیں کوئی ذی نفس زندہ نہیں ہے۔ ہر شے' تمام مظاہر و اثبات فنا کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ صرف نفی زندہ ہے۔ نفی اور فنا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ علی نے حیرت زدہ اور کسی حد تک سراسیمہ نظروں سے گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر ڈالی۔ سال خوردہ اور بے رونق مکانوں کو دیکھا۔ یکایک اسے ڈر لگا۔ اس کے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑتی چلی گئی۔ گلی کا سناٹا اور ویرانی اور بلب کی زرد روشنی اور سر..... کے اوپر سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک بے پناہ' بے کنار اور لرزہ خیز ویرانے میں بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔ بالکل تنہا اور بے آسرا اور چاروں طرف نظر نہ آنے والی آسیبی بلائیں گھات لگائے بیٹھی ہیں۔ جونہی انہیں موقع ملے گا' وہ اسے دبوچ لیں گی۔ یہ احساس بہت خوف ناک تھا۔ اس نے یکایک زور زور سے کئی سانسیں لیں اور گردن موڑ کر راجا کی طرف دیکھا۔

ان کے مطلوبہ مکان کا نمبر تیرہ تھا۔ یہ ایک تین منزلہ مکان تھا اور اوپر سے نیچے تک اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈیوڈ نے مکان کا جائزہ لیا پھر راجا سے مخاطب ہوا "یہی ہاؤس ہے نا۔"

"میرے پاس تو یہی ایڈریس ہے۔" راجا نے آہستہ سے کہا۔

"ٹھیک ہے' میں گھنٹی بجاتا ہوں۔" ڈیوڈ نے ان دونوں کو گہری نظروں سے دیکھا "اب تمہاری جرنی کھتم ہوئی۔ تم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ گڈ لک ٹو یو بوتھ' پرنتو ایک بات یاد رکھو۔"

"کیا.....؟"

"تم کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اِدر کیسے رہنا ہے۔ کیا کرنا ہے' کوئی مسٹیک نہیں کرنے کا۔" اس کا لہجہ یکایک درشت اور دھمکی آمیز ہو گیا "پرنتو اگر تم نے گلتی کیا اور پکڑا گیا تو پولیس کو ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتانے کا۔ اور کچھ بھی بولنا' پر ہمارا نام نہیں۔ اگر ہمارا نام بولو تو ہم گارنٹی نہیں دے سکتا کہ رابرٹ تمہارے ساتھ کیا کرے گا۔ سمجھ گئے نا۔"

علی کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چیز اس کے حلق میں پھنس گئی ہے۔

ڈیوڈ نے گھنٹی بجائی۔ ایک بار' دوبار' تین بار' دروازہ زور سے کھٹکھٹایا بھی۔ کئی منٹ کے انتظار کے بعد آخر کار پہلے ایک کمرے کی کھڑکی میں مدھم سی روشنی پھیلی۔ پھر پیسیج کی بتی جلی اور دروازے کے اوپر کا دھندلا شیشہ روشن ہوگیا۔ پھر قدموں کی ہلکی چاپ سنائی دی اور کسی نے نیند میں ڈوبی ہوئی خشک آواز اور جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کون ہے؟"

ڈیوڈ نے لیٹر بکس سے منہ لگا کر کہا "ڈور کھولو۔ اور تمہارا آدمی آیا ہے۔" پھر اس نے گردن گھما کر راجا سے کہا "تم بولو۔"

"دروازہ کھولیے۔ ہم لوگ وطن سے آئے ہیں۔"

"وطن سے آئے ہو۔" دوسری طرف سے حیرت زدہ آواز سنائی دی "مگر بھئی کون ہو تم؟"

"دیکھیے کیا یہاں بشیر احمد صاحب رہتے ہیں؟"

دوسری طرف چند پل خاموشی رہی پھر کہا گیا "ہاں رہتے تو ہیں۔ مگر وہ اس وقت نہیں ہیں۔ کام پر گئے ہیں۔ رات کی شفٹ ہے ان کی۔"

راجا نے پس و پیش کے عالم میں پہلے علی اور پھر ڈیوڈ کی طرف دیکھا پھر اضطراری انداز میں بولا "آپ دروازہ کھولیے۔ ہم لوگ بشیر صاحب کے آدمی ہیں۔ وطن سے آئے ہیں۔ اس وقت اور کہیں نہیں جاسکتے۔"

دروازے کے دوسری جانب پھر خاموشی چھاگئی۔ لگتا تھا' دوسری طرف جو بھی ہے' بدستور تذبذب میں ہے اور طے نہیں کر پارہا ہے کہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے۔ چند لمحے گزرے پھر شاید اس نے فیصلہ کرلیا کہ دروازہ کھولنے میں کچھ حرج نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے تالے کا بٹن دبایا۔ پھر ناب گھومی اور دروازہ کھلا۔ دروازے کے اندر تہمد اور بنیان میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر آدمی نظر آیا۔ اس نے گردن ذرا آگے بڑھا کر شک آلود نظروں سے یوں انہیں گھورا جیسے چور اچکوں یا پولیس کے افسروں کو دیکھ رہا ہو۔

"کون ہے....؟" اس نے کھردری آواز میں کہا۔

ڈیوڈ نے آگے بڑھ کر ذرا جھلائے ہوئے انداز میں کہا "سنبھالو انہیں' یہ تمہارے آدمی ہیں۔"

اس آدمی نے سرد نظروں سے راجا اور علی کو گھورا "تم لوگ آئے ہو؟"

"ہاں۔"

"اچھا اندر آجاؤ" وہ دروازہ نصف سے زیادہ کھول کر ایک طرف ہٹ گیا۔

ڈیوڈ نے راجا کے کندھے پر ہاتھ رکھا "جاؤ تم لوگ۔ میں بعد میں پھر آؤں گا۔ اور دیکھو بہت کیئر فل رہنے کا۔ سمجھ گئے نا' گڈ نائٹ۔"

وہ اندر داخل ہوئے اور ادھیڑ عمر آدمی کی رہنمائی میں چلتے ہوئے لونگ روم میں پہنچے۔ ادھیڑ عمر آدمی نے بتی جلائی۔ پھر ہیٹر آن کیا اور انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ علی ہیٹر کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اوسط درجے کا کمرا تھا۔ ایک پرانا میل خوردہ صوفہ سیٹ دائیں جانب والی دیوار کے ساتھ پڑا تھا۔ دو تین کرسیاں تھیں۔ کھڑکی کے قریب ایک بڑی میز تھی۔ قالین خاصا پرانا اور گہرے سرخ رنگ کا تھا جس پر بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ پہلے کبھی وہ قالین ممکن ہے خوش رنگ رہا ہو مگر اب بھدا اور بوسیدہ ہوچکا تھا۔ یہی حال وال پیپر کا تھا۔ نہ صرف جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا بلکہ بہت میلا بھی ہوگیا تھا۔ لگتا تھا' برسوں سے وال پیپر بدلا نہیں گیا ہے۔ دیواروں پر دو تین طغرے آویزاں تھے۔ کمرے کا جائزہ لے کر علی نے راجا کی طرف دیکھا۔

"یار بڑی سردی ہے۔"

"ہاں یار' میرا تو برا حال ہے۔ لگتا ہے رگوں میں خون تک جم گیا ہے۔"

علی نے جیب سے پیکٹ برآمد کیا۔ دو سگریٹ نکالیں پھر ایک راجا کی طرف بڑھا کر بولا "وہ صاحب کہاں غائب ہوگئے؟"

"پتا نہیں' کچھ کہا بھی نہیں۔"

علی نے قدرے توقف کیا پھر آواز دبا کر بولا "یار راجا' ہم لوگ آخر کار یہاں تک پہنچ تو گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا ہوگا۔ ہم لوگ آگے کیا کریں گے؟"

راجا نے کش لیا۔ گہری نظروں سے علی کو دیکھا پھر کہنے لگا "یار میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہم لوگوں نے جو قدم اٹھایا ہے' اس میں تو ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔ تو پھر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ ویسے یہ ہے کہ کل بشیر صاحب سے مشورہ کریں گے۔ امید ہے وہ ضرور ہماری مدد کریں گے۔"

ادھیڑ عمر آدمی انہیں کمرے میں چھوڑ کر کچن میں چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی کوئی پانچ منٹ بعد ہوئی۔ علی اور راجا کو یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ چائے لے کر آیا تھا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے مگ تھام لیے تو وہ تیسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر ہیٹر کی آنچ میں ہاتھ تاپتا رہا اور انہیں گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کے انداز سے صاف ہویدا تھا کہ الجھن میں ہے۔ بہت کچھ جاننا اور پوچھنا چاہتا ہے لیکن طے نہیں کرپارہا ہے کہ کس طرح پوچھے۔ چند منٹ گہری خاموشی میں گزرے۔ پھر اس... آدمی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"تو تم لوگ بشیر صاحب کے آدمی ہو؟"

"ہاں۔" راجا نے محتاط لہجے میں جواب دیا "میں راجا ہوں اور یہ علی ہے۔" پھر ذرا رک کر پوچھا "آپ کا کیا نام ہے؟"

"میرا نام صدیق علی ہے۔"

"کیا آپ ہی اس مکان کے مالک ہیں؟"

"ارے نہیں۔" صدیق نے ہنس کر جواب دیا "اس مکان

کے مالک تو چوہدری کرم داد ہیں۔ وہ اپنے بھائی سے ملنے برمنگھم گئے ہوئے ہیں۔ شاید پرسوں تک آئیں۔ میں تو یہاں لاجر ہوں۔"

صدیق نے بے تکلفی سے علی کا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ نکالی پھر اضافہ کیا "مگر تم اس وقت کیسے آئے ہو۔ یہ تو کوئی فلائٹ کا ٹائم نہیں ہے۔ کیا بشیر صاحب کو معلوم تھا کہ تم لوگ آنے والے ہو؟"

"ہم لوگ دو دن سے لندن میں تھے۔" راجا نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

"اور وہ دونوں کون تھے؟" صدیق نے سوال کیا۔

"وہ ہمیں چھوڑنے آئے تھے۔" راجا نے محتاط لہجے میں کہا۔

صدیق چند لمحے چپ رہا اور گہری تجسس آمیز نظروں سے انہیں گھورتا رہا پھر معاً سر ہلا کر بولا "اچھا' اچھا' میں سمجھ گیا۔ مگر دیکھو بہت احتیاط کرنا۔ اور دیکھو' مجھے صبح کام پر جانا ہے۔ تم لوگوں کی چائے ختم ہو گئی ہو تو چلو میرے ساتھ۔ ایک کمرا خالی ہے۔ اس میں سو جاؤ اور ہاں اس گھر میں میرے اور بشیر صاحب کے علاوہ آٹھ افراد اور رہتے ہیں۔ ان سے کچھ مت کہنا۔ بشیر صاحب کو سب کچھ بتانا۔ پھر جیسا وہ کہیں' ویسا کرنا۔ سمجھ گئے نا' آؤ اب میرے ساتھ۔"

"بشیر صاحب کب آئیں گے؟"

"وہ جس فیکٹری میں کام کرتے ہیں' میں بھی وہیں ہوں۔" صدیق نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "ابھی میں کام پر جاؤں گا تو انہیں تمہارے بارے میں بتا دوں گا۔ وہ واپس آکر خود ہی تم سے ملاقات کرلیں گے۔"

انہوں نے اپنے بیگ اٹھائے اور صدیق علی کے پیچھے چل پڑے۔ دوسری منزل پر دو کمرے تھے۔ ان میں سے ایک خالی تھا۔ صدیق انہیں اس کمرے میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ کیونکہ وہ نچلی منزل کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ علی اور راجا نے اپنے بیگ ایک طرف رکھے اور کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اوسط سائز کا کمرا تھا۔ دائیں اور بائیں جانب کی دیواروں کے ساتھ دو سنگل بیڈ لگے ہوئے تھے جن پر گہرے سرمئی رنگ کے کئی کمبل پڑے تھے۔ عقبی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی اور کھڑکی کے قریب ہی ایک سال خوردہ' بدرنگ الماری استادہ تھی۔ دیواروں پر کہیں کہیں انگریز عورتوں کی نیم عریاں تصویریں چپکی ہوئی تھیں۔ علی گم صم نظروں سے کھڑکی کے بوسیدہ پردے' دیوار کے بدرنگ پیپر اور عورتوں کی نیم عریاں تصویروں کو دیکھتا رہا۔ ایک غیر یقینی کیفیت میں مبتلا' گمشدہ اور سراسیمہ' جیسے اسے یقین نہ ہو کہ وہ واقعی اس وقت اس کمرے میں موجود ہے۔ پھر اس نے زور سے سانس لی۔ اپنے تھر تھر کانپتے بدن کو جنبش دی اور آگے بڑھ کر ایک بیڈ پر بیٹھ گیا۔ تھکے تھکے انداز میں جھک کر جوتے اور موزے اتارے اور موٹے موٹے کمبلوں کے اندر گھس گیا۔ پھر بتی بند کردی گئی۔ راجا پہلے ہی اوڑھ لپیٹ کر لیٹ گیا تھا۔ علی نے آنکھیں بند کیں اور اپنے ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کی۔ کمبل بہت پرانے اور بوسیدہ تھے اور ان میں ایک تیز اور انتہائی ناگوار بو بسی ہوئی تھی جیسے مرے ہوئے جانور یا پیشاب کی کھراند ہوتی ہے۔ علی کو سانس لینے میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ بو اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ مگر اس کا دھیان اس سڑی ہوئی بو کی طرف نہیں تھا۔ نہ ہی اس شدید سردی کی طرف جو اس کے رگ و ریشے اور ہڈیوں کی پور پور میں سما گئی تھی اور اس کے پورے جسم کو یخ کر رہی تھی۔ اس کا دھیان تو گزرے ہوئے پُرصعوبت سفر کی طرف تھا۔ کتنے ہزار میل کا سفر اس نے طے کیا تھا۔ مگر اب وہ انگلینڈ میں تھا اور راچڈیل نام کے ایک شہر کے ایک کہنہ سال مکان میں موجود تھا۔ یہاں تک تو آگیا ہے۔ مگر اب کیا ہوگا۔ کل کیا ہوگا؟ وہ وسوسوں اور اندیشوں میں گھرا ہوا سوچتا رہا اور سونے کی کوشش کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے بدن کچھ گرم ہوا۔ تین دن اور دو راتوں کی جاگ اور درماندہ آنکھوں میں آہستہ آہستہ نیند اتری اور پھر وہ گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

○☆○

بشیر احمد نے راجا کا دیا ہوا خط پڑھا۔ خشمگیں نظروں سے راجا اور علی کو دیکھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ ان کے بشرے سے صاف عیاں تھا کہ ان دونوں کی غیر متوقع اور اچانک آمد سے وہ خوش نہیں بلکہ شاید کچھ برہم ہی ہیں۔ لیکن مجبور ہیں کہ اب وہ دونوں سر پر آہی گئے ہیں تو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ بہرحال وہ دونوں ان کے ملک سے آئے تھے۔ ان کے ہم وطن تھے اور راجا کے چچا سے کسی زمانے میں ان کے کچھ مراسم بھی رہے تھے۔ جو بھی تعاون اور رہنمائی ضروری ہو' وہ انہیں کرنا ہوگی۔ کچھ دیر بعد وہ سوچ کے گرداب سے نکلے اور ایک بار پھر ترش نظروں سے راجا کو گھورا۔

"تمہارے چچا کیسے ہیں؟"

"جی' اچھے ہیں۔ نوکری چھوڑ دی ہے۔ اب اپنا بزنس کرتے ہیں۔" راجا نے ڈرتے ڈرتے اطلاع دی۔

"اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر تم برطانیہ پہنچ جاؤ تو سیدھے میرے پاس آؤ؟"

"جی ہاں۔"

بشیر احمد نے قدرے توقف کیا پھر یکایک تلخ لہجے میں بولے "مگر تم لوگ یہاں آئے کیوں۔ کس نے مشورہ دیا تھا تمہیں؟"

"جی' دیکھیے' بات یہ ہے کہ...." راجا ہکلانے لگا "آج کل تو سب ہی باہر کے چکر میں رہتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ اپنے یہاں کیسے حالات ہیں۔ کتنے مسائل اور پریشانیاں اور.... اس لیے ہم نے سوچا کہ...." راجا بات ادھوری ہی چھوڑ کر چپ ہو گیا۔

"اس لیے تم نے سوچا کہ چلو برطانیہ۔" بشیر احمد نے طنزیہ لہجے میں راجا کی بات پوری کی "وہاں ہر طرف پاؤنڈوں کے درخت

لگے ہیں۔ تم بھی اچک اچک کر ڈھیر سارے نوٹ توڑ لوگے اور سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ ارے میاں' احمقوں کی جنت میں رہتے ہو تم۔ اب وہ پہلے والی بات نہیں رہی جو پچیس تیس سال قبل تھی۔ اب حالات بہت بدل گئے ہیں۔ بیکاری بڑھ گئی ہے۔ مہنگائی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ طرح طرح کے مسائل یہاں لوگوں کو درپیش ہیں اور پھر تم لوگ تو ناجائز طور پر داخل ہوئے ہو اس ملک میں۔ اس کا مطلب سمجھتے ہو تم؟"

راجا نے بے بسی اور شرمندگی سے بشیر احمد کو دیکھا۔ مگر چپ رہا۔

"اس کا مطلب ہے خطرہ اور پریشانی۔" بشیر احمد نے بات آگے بڑھائی "تم لوگوں کو چوروں کی طرح رہنا ہوگا۔ چھپ چھپ کر' آزادی سے نہ کہیں آجا سکو گے' نہ لوگوں سے مل سکو گے۔ پولیس ان لوگوں کی بو سونگھتی پھرتی ہے' جو غیر قانونی طور پر یہاں آئے ہیں۔ اگر دھر لیے گئے تو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حوالات' مقدمہ اور پھر جبری واپسی' پولیس جہاز میں بٹھا دے گی۔ اور تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ واپس جاؤ تو پھر اپنے ملک کی پولیس تمہارا استقبال کرے گی۔ غضب خدا کا' جانے کیا ہو گیا ہے لوگوں کو۔" بشیر احمد خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائے تھے "جسے دیکھو' یورپ' امریکا کے چکر میں مبتلا ہے۔ بس منہ اٹھائے چلا آرہا ہے مارک' پاؤنڈ اور ڈالر کے چکر میں۔ اگر جائز طریقے سے نہیں آسکتے تو ناجائز طور پر ہی سہی مگر برطانیہ' جرمنی یا ڈنمارک آنا ضرور ہے۔ کسی بات کا کوئی احساس نہیں۔ نہ مصائب و مشکلات کا' نہ ماں باپ' بیوی بچوں کا اور نہ اپنے ملک کا۔ ارے میاں میں کہتا ہوں' اپنے ملک میں ایسی کیا خرابی ہے۔ دو روٹیاں تو وہاں بھی مل ہی جاتی ہیں۔" انہوں نے راجا کو گھورتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

راجا اور علی دونوں ہی بے حد نروس ہو رہے تھے۔ انہیں گمان تک نہیں تھا کہ بشیر احمد اس قدر برہم ہو جائیں گے۔ جب وہ چپ ہوئے تو راجا نے پژمردگی سے کہا "بشیر چچا آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اپنے وطن سے ہمیں بھی محبت ہے اور ہم اس کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن بات صرف دو روٹیوں کی نہیں۔ بلکہ....."

"ارے پتر یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ مصنوعی اور کھوکھلی۔ وطن سے کسے محبت ہے۔ تمہیں' مجھے' ان سیاست دانوں کو جو جرم کر کے وزارتِ انصاف کی کرسی پر بیٹھتے ہیں یا ان سرکاری افسروں کو جو بدعنوانی میں خود ہی ملوث ہوتے ہیں اور یا پھر ان سرمایہ داروں کو جو کروڑوں کا قرضہ واپس نہیں کرتے بلکہ مزید قرضے کی درخواستیں دیتے ہیں۔ نہیں' سب فضول ہے' کھوکھلے دعوے اور کچھ نہیں۔ وطن کا پاس ہو تو ہم لوگ وہ سب کچھ نہ کریں' جو کر رہے ہیں۔" انہوں نے بات ختم کی اور غصے سے پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ کھینچی۔

علی نے ڈرتے ڈرتے زبان کھولی "وہ تو ٹھیک ہے جناب مگر اب تو یہاں آہی گئے ہیں ہم لوگ۔"

بشیر احمد نے تند نظروں سے علی کو گھورا "یہی تو مصیبت ہے کہ تم لوگ یہاں آگئے ہو۔ اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" رکے' پھر تجسس آمیز لہجے میں بولے "مگر یہ بتاؤ تم یہاں پہنچے کیسے؟ کون لوگ تمہیں یہاں لائے تھے۔ اور کس طرح....؟"

راجا خفت سے مسکرایا پھر کہنے لگا "بس جی' کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔ ان لوگوں کا ایک باقاعدہ گروہ ہے' جو یہ کام کرتے ہیں۔ ان کے آدمی ہر جگہ ہیں۔ جرمنی میں' اٹلی' فرانس اور بلجیم میں اور انگلینڈ میں۔ ساتھ ہی اپنے ملک میں بھی ان کے ایجنٹ ہیں۔ میں نے ایک ٹریولنگ ایجنٹ کے ذریعے ان سے رابطہ قائم کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اٹلی کا ویزا دیا جو جعلی تھا مگر کسی دشواری کے بغیر اٹلی پہنچ گئے۔ وہاں سے وہ ہمیں بلجیم لے گئے اور کئی دن تک ساحلی علاقے میں واقع ایک گاؤں کے قریب ایک شکستہ عمارت کے تہ خانے میں رکھا۔ وہاں اور بھی کئی آدمی تھے جو پہلے سے موجود تھے اور سفر کا انتظام کر رہے تھے۔ میرے وہاں پہنچنے کے دو دن بعد علی آیا تھا۔ جب کافی آدمی جمع ہو گئے تو ایک موٹر بوٹ میں ہمارا سفر شروع ہوا۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ وہ لوگ ہمیں کہاں کہاں لے گئے تھے۔ کیونکہ ہم سب بوٹ کے ایک زیریں حصے میں بند تھے اور باہر بالکل نہیں دیکھ سکتے تھے۔ صرف موٹر بوٹ کا شور اور لہروں کی آواز ہمیں سنائی دیتی تھی۔ ہاں اتنا ضرور علم ہے کہ سفر بہت طویل تھا اور یہ کہ جب ہم برطانیہ کے ایک ویران ساحلی علاقے میں پہنچے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہاں سے وہ لوگ ہمیں ایک وین میں بھر کر لندن کے کسی مضافاتی شہر میں لے گئے تھے۔"

"تمہاری کہانی بھی غالباً یہی ہوگی؟" بشیر احمد نے علی کی طرف دیکھا۔

"جج.....جی ہاں۔" علی نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تم لوگوں کو ڈر نہیں لگا تھا؟"

راجا جھینپ کر مسکرایا "جی' ڈر تو بہت لگا تھا۔"

"پھر بھی جان کی بازی لگا دی' ہے نا۔" بشیر احمد نے تلخی سے کہا "خیر' اب تو پہنچ ہی گئے ہو۔ یہ بتاؤ اس ملک کے بارے میں کتنا جانتے ہو تم لوگ؟"

"جی' ہمیں تو کچھ زیادہ علم نہیں۔" علی نے پست آواز میں کہا۔

"غضب خدا کا' کچھ بھی نہیں جانتے پھر بھی چلے آئے ہیں۔ اس سے زیادہ عاقبت نا اندیشی اور کیا ہو سکتی ہے۔" وہ رک کر چند لمحے سوچتے رہے پھر سر ہلا کر بولے "دیکھو ابھی میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اب حالات بہت بدل گئے ہیں۔ پہلے والی بات نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے یہاں بیکاری بہت کم تھی۔ ورکروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لیے حکومت کچھ چشم پوشی سے کام لیتی تھی۔ مگر اب

بیکاری بہت زیادہ ہے۔ اس لیے حکومت بہت سختی کرتی ہے۔ پولیس کتوں کی طرح اِدھر اُدھر سونگھتی پھرتی ہے۔ آئے دن فیکٹریوں میں چھاپے پڑتے ہیں اور غیر قانونی طور پر کام کرنے والے پکڑے جاتے ہیں۔ تم لوگوں کو بھی بہت محتاط رہنا ہوگا۔ کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ اس مکان میں جو لوگ رہتے ہیں' وہ قابلِ اعتبار ہیں۔ اندر کی بات باہر نہیں جانے دیتے۔ لیکن باہر کسی سے زیادہ دوستی بڑھانے کی ضرورت نہیں۔"

"ہماری رہائش کا کیا ہوگا۔ کیا ہم لوگ یہاں رہ سکتے ہیں؟" راجا نے سوال کیا۔

"ہاں' اوپر جس کمرے میں تم لوگ سوئے تھے' وہ اتفاق سے خالی ہے اور تم اس میں رہ سکتے ہو۔ میں چوہدری کرم داد سے بات کروں گا۔ اگرچہ وہ بڑا سؤر آدمی ہے مگر انکار نہیں کرے گا۔ لیکن...."

"لیکن کیا....؟" علی نے تھوک نگل کر پوچھا۔

"نوکری۔" بشیر احمد نے تفکر آمیز نظروں سے دونوں کو گھورا۔ "ایک تو یہاں بیکاری بہت ہے۔ دوم تم لوگ غیر قانونی طور پر آئے ہو۔ یہاں باضابطہ طور پر ملازمت کرنے کے لیے انشورنس کارڈ کا ہونا ضروری ہے جو تم لوگ حاصل نہیں کرسکتے۔ لہٰذا تمہیں بغیر کارڈ کے اور چوری چھپے کام کرنا ہوگا۔ اور اس میں کئی پریشانیاں ہوں گی۔"

راجا اور علی نے سہمی نظروں سے بشیر احمد کو دیکھا۔

"خیر۔" بشیر احمد نے قدرے توقف کے بعد طویل سانس لی۔ "زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک آدمی کو جانتا ہوں۔ چوہان نام ہے۔ سالا ایک نمبر کا حرامی ہے۔ مگر نوکری کے سلسلے میں تمہاری ضرور مدد کرے گا۔ ابھی دو چار روز تم لوگ آرام کرو' پھر میں اس سالے چوہان سے بات کروں گا۔"

"جی بہتر ہے۔"

"تمہارے پاس پیسے ہیں؟" یکایک بشیر احمد نے پوچھا۔

"ہاں جی' ہم دونوں کے پاس تین چار پاؤنڈ ہیں۔" راجا نے پژمردہ آواز میں جواب دیا۔

"گویا پیسے بھی نہیں ہیں۔" بشیر احمد نے کہا۔ ان کی آواز میں تلخی .... گھلی ہوئی تھی "حد ہوگئی۔ جیب میں پیسہ نہیں اور چلے آئے ہیں انگلینڈ' خیر میں کچھ کروں گا۔ تمہارے یہ کپڑے اور جوتے یہاں کے لیے قطعی مناسب نہیں۔ خاص طور پر اس سردی کے موسم میں۔" انہوں نے رک کر سگریٹ کا ٹوٹا ایش ٹرے میں بجھایا۔ پھر پوچھا "کھانا کھایا ہے؟"

وہ دونوں چپ رہے۔

"گویا کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔" انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔ "خیر تم لوگ آرام سے بیٹھو' ٹی وی دیکھو۔ میں کچھ کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔

اگلے تین چار دن وہ دونوں اس مکان میں رہنے والوں کی توجہ کا مرکز بنے۔ رفتہ رفتہ سب ہی کو ان کی آمد کا علم ہوگیا تھا۔ نیز یہ بھی کہ ان کی آمد غیر قانونی ہے۔ چنانچہ فرداً فرداً ہر شخص انہیں دیکھنے آیا۔ کچھ اس طرح گویا وہ کوئی عجوبہ یا تماشا ہوں۔ ہر آنے والا دروازے میں جھانکتا۔ زور سے یوں سلام داغتا گویا برسوں کی جان پہچان ہو۔ پھر ہونٹوں پر ایک جبراً سجائی ہوئی مسکراہٹ لیے اندر داخل ہوتا۔ رسمی خیر خیریت کے بعد بار بار پوچھے گئے سوالات ایک بار پھر پوچھے جاتے۔ کب آئے؟ کیسے آئے؟ کتنا روپیہ دینا پڑا۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟ پھر مسرت کا اظہار کیا جاتا۔ اس کے بعد اَن گنت بار دہرائی گئی ہدایتوں کو ایک بار پھر دہرایا جاتا۔ محتاط رہنے کی تلقین و تاکید کی جاتی۔ ساتھ ہی ہر شخص نہ صرف اپنے پورے تعاون کا یقین دلاتا بلکہ نیک خواہشات کا اظہار بھی کرتا۔ علی اور راجا اپنی کہانی سناتے سناتے اور ضروری ہدایات سنتے سنتے تنگ آگئے تھے۔ مگر انہوں نے ضبط سے کام لینے اور اپنی بیزاری چھپائے رکھنے میں ہی عافیت سمجھی۔ کیونکہ بہرحال وہ دونوں غیر قانونی طور پر آئے تھے اور انہیں اسی مکان میں' انہی لوگوں کے درمیان رہنا تھا۔ لہٰذا کسی قسم کی بدمزگی اور تلخی پیدا کرنا مصلحت اور دور اندیشی کے خلاف ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے ہر آنے والے کو اپنی کہانی سنائی۔ ان کی نصیحتیں سنیں اور ان پر عمل کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

بشیر احمد نے کہا تھا۔ اس گھر میں رہنے والے سبھی لوگ قابلِ بھروسا ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ اس مکان میں رہنے والے افراد سب کے سب ایشیائی تھے۔ اور ماسوا دو ایک کے' سب ہی کے اپنے مسائل تھے' اپنی مجبوریاں تھیں۔ جو انہیں نہ صرف قانون سے دامن بچانے اور آنکھیں چرانے پر مجبور کرتی تھیں بلکہ ایک دوسرے پر بھروسا کرنے پر بھی مجبور کرتی تھیں۔ انہیں جلدی ہی معلوم ہوگیا کہ دو افراد قربان اور نواز شاہ بھی انہی کی طرح غیر قانونی طور پر برطانیہ میں داخل ہوئے تھے۔ نواز شاہ اسمگل ہو کر آیا تھا جبکہ قربان تفریحی ویزا لے کر آیا تھا پھر غائب ہوگیا تھا۔ گزشتہ چار ماہ سے ان کا قیام دوسری منزل کے ایک کمرے میں تھا۔ جبکہ دوسرا کمرا علی اور راجا کے حصے میں آیا تھا۔ درمیانی منزل پر تین کمرے تھے جن میں سے ایک میں بشیر احمد کا قیام تھا۔ دوسرے کمرے میں سلیم خاں اور رحمت علی رہتے تھے۔ دونوں ایک ہی گاؤں کے تھے اور شاید ان کی آپس میں کچھ رشتے داری بھی تھی۔ قربان کی طرح سلیم خاں بھی کوئی ایک سال قبل ویزا لے کر آیا تھا۔ لیکن ویزے کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے سیاسی پناہ کی درخواست دے دی تھی۔ اپنی درخواست میں اس نے لکھا تھا کہ وہ ایک ایسی سیاسی جماعت کا سرگرم کارکن ہے جو فی الوقت موجودہ حکومت کے عتاب کا شکار ہے۔ اگر وہ واپس گیا تو

اسے ناجائز اور بے بنیاد مقدموں میں پھانس کر طویل عرصے کے لیے جیل بھیج دیا جائے گا اور یا پھر مخالف جماعت کے غنڈے اسے قتل کردیں گے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اپنے ملک میں وہ ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان کرتا تھا اور سیاست سے اس کا دور کا بھی علاقہ نہیں تھا۔ اس کا مقدمہ تقریباً ایک سال سے عدالت میں تھا اور آثار سے پتا چلتا تھا کہ فیصلہ ہونے میں کوئی سال بھر اور لگ جائے گا۔ سلیم خاں کو یقین نہیں تھا کہ فیصلہ اس کے حق میں ہوگا اور اسے مزید کچھ سال برطانیہ میں رہنے کا موقع مل سکے گا۔ زیادہ امکان یہ تھا کہ وہ مقدمہ ہارے گا اور پھر اسے فوراً ہی واپس بھیج دیا جائے گا۔ اس خدشے کے پیش نظر وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ بنانے کی دھن میں مبتلا رہتا تھا۔ اسے قانونی طور پر کام کرنے کا حق نہیں تھا۔ چوری چھپے کام کرتا تھا اور وہ بھی ساتوں دن۔ صبح کام پر جاتا تو رات میں آتا۔ کھانا کھاتا۔ کچھ وقت بات چیت میں گزارتا اور پھر دو موٹے موٹے لحافوں میں گھس کر آنکھیں بند کرتا تو پھر صبح الارم کے شور مچانے پر ہی اٹھتا۔

تیسرے کمرے میں سلیمان اور منظور احمد بیدل کی رہائش تھی۔ ان دونوں میں کوئی بھی بات مشترک نہیں تھی۔ مزاج اور عادات کے لحاظ سے دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ پھر بھی ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ سلیمان بظاہر ایک خوش مزاج آدمی تھا مگر درحقیقت وہ بہت فطین اور چرب زبان تھا۔ باتیں کرنے اور لوگوں کو متاثر کرنے کا ہنر اسے خوب آتا تھا۔ بشیر احمد نے علی اور راجا کو پہلے ہی دن تاکید کردی تھی کہ سلیمان سے ہوشیار رہیں اور قرض وغیرہ ہرگز نہ دیں۔ کیونکہ قرض لے کر واپس کرنا سلیمان کا اصول نہیں تھا۔ سلیمان کوئی آٹھ نو ماہ قبل شادی کرکے انگلینڈ آیا تھا۔ اس کی سسرال راچڈیل میں ہی تھی۔ پانچ ماہ وہ اپنی سسرال میں اپنی بیوی کے ساتھ ہی رہا تھا مگر پھر طلاق ہوگئی۔ طلاق کے اسباب کیا تھے؟ قصور کس کا تھا؟ اس کا یا اس کی بیوی کا؟ اس ضمن میں کچھ کہنا مشکل تھا۔ خود سلیمان کا کہنا تھا کہ وہ تو ایک نہایت شریف، دیانت دار، مخلص، محنتی، ایمان دار اور محبت کرنے والا آدمی ہے۔ اس نے اپنی جانب سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ بیوی اور ساس سسر کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کی۔ مگر اس کی ہر کوشش رائگاں گئی۔ اس کا سسر ایک بددماغ، لالچی اور بے ہودہ آدمی ہے اور بیوی فیشن پرست، پھوہڑ اور بدزبان ہے۔ اسے شوہر سے زیادہ ایک دُم ہلانے والے کتے کی ضرورت تھی۔ سلیمان کا کہنا تھا کہ حالات کو سنبھالنے اور طلاق کو ٹالنے کی نیت سے اس نے کسی حد تک کتا بننے کی کوشش بھی کی تاہم بات نہیں بنی اور طلاق ہوگئی۔

سلیمان کی چرب زبانی اور عادات واطوار کے پیش نظر کوئی بھی اس کی باتوں پر یقین نہیں کرتا تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ تنازعے کی ابتدا اسی کی جانب سے ہوئی ہوگی۔ اور اس نے حالات کو مزید خراب کیا ہوگا۔ بہرحال طلاق کے بعد وہ چوہدری کرم داد کے مکان میں آگیا اور منظور احمد بیدل کے ساتھ رہنے لگا۔

اب گزشتہ دو تین ماہ سے وہ دیوانہ وار اس جستجو میں مبتلا تھا کہ ویزے کی میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی کہیں اس کی شادی ہوجائے تاکہ اسے واپس نہ جانا پڑے۔ اس ضمن میں اسے کچھ کامیابی بھی ہوئی تھی۔ ایک ایسی فیملی سے اس کے تعلقات استوار ہوگئے تھے جہاں ایک طلاق یافتہ عورت موجود تھی جو سلیمان سے عمر میں سات آٹھ سال بڑی تھی۔ نواز شاہ کے بیان کے مطابق، جس نے اس عورت کو ایک بار مارکیٹ میں دیکھا تھا، ہرگز اس قابل نہیں تھی کہ کوئی نوجوان اس پر دل و جان نچھاور کرے۔ مگر سلیمان ہفتے میں تین بار باقاعدگی سے اس کے گھر جاتا تھا اور اکثر اسے تحفے بھی دیتا تھا۔ افواہ گرم تھی کہ جلد ہی وہ اس عورت سے شادی کرلے گا۔ دو تین ہفتے کے بعد جب علی اور راجا کے مراسم سلیمان سے خاصے بے تکلفانہ ہوگئے تھے تو علی نے ایک شام اس سے اس موضوع پر گفتگو کی۔

"ہاں کامیابی کی امید تو ہے۔" سلیمان نے ہنس کر کہا۔

"مگر بھئی وہ تو سنا ہے تم سے عمر میں بڑی ہے۔ اور صورت شکل بھی بس واجبی سی ہے۔"

"تو کیا ہوا۔"

"کیا تم کو اس سے واقعی لگاؤ ہے؟"

"کمال کرتے ہو یار۔ اس سے محبت کرنا کوئی ضروری تو نہیں۔"

"پھر بھی تم اس سے شادی کرلوگے؟" علی نے حیرت سے کہا۔

سلیمان نے گہری معنی خیز نظروں سے علی کو دیکھا "دیکھو علی، میرے پاس صرف تین ماہ کا وقت ہے۔ اگر بیماری وغیرہ کا بہانہ کروں تو ایک دو ماہ اور مل جائیں گے۔ اسی مدت کے اندر مجھے شادی کرنا ہے اور ہر حال میں کرنا ہے۔" اس نے رک کر زور سے سانس لی "کیونکہ میں واپس نہیں جانا چاہتا۔"

"تو تم اس سے صرف اس لیے شادی کرلوگے کیونکہ تمہیں یہاں رہنا ہے۔" علی کا استعجاب کچھ اور بڑھ گیا "مگر یار یہ تو کچھ دانش مندی نہیں۔ اس کے ساتھ تم پوری زندگی کیسے گزارو گے؟"

سلیمان معنی خیز انداز میں ہنسا "یار پوری زندگی کے مسئلے پر تو بعد میں غور ہوگا۔ پہلے شادی تو ہو۔"

علی سلیمان کی معنی خیز ہنسی کے مفہوم تک پہنچ گیا۔ مسکرا کر بولا "اچھا تو یہ بات ہے۔ تو پھر شادی کب کررہے ہو؟"

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔" سلیمان معاً سنجیدہ ہوگیا "میں نے اپنا عندیہ تو دے دیا ہے۔ ابھی اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ تاہم امید کافی ہے کہ ناکامی نہیں ہوگی۔"

نچلی منزل پر لونگ روم کے علاوہ ایک بیڈ روم تھا اور ایک سٹنگ روم۔ چوہدری کرم داد نے سٹنگ روم کو بیڈ روم بنالیا تھا اور

اس میں خود رہتا تھا۔ اس کے تین بچے تھے جو شادی شدہ تھے۔ بیوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زیادہ تر وطن میں رہتا تھا کیونکہ وہاں کرم داد کی زمینیں اور جائداد تھی اور اس کی دیکھ بھال ضروری تھی۔ چھوٹے بیٹے کی شادی اس نے اپنے چھوٹے بھائی چوہدری فضل داد کی لڑکی سے کی تھی۔ وہ برمنگھم میں ہی اپنی سسرال میں رہتا تھا۔ بیٹی کینیڈا میں تھی۔ کیونکہ وہاں چوہدری کرم داد کے کئی رشتے دار تھے اور اس کی بیٹی کی شادی ایک رشتے دار کے بیٹے سے ہوئی تھی۔ بیوی کی وفات اور بچوں کے پاس نہ ہونے کے باوجود چوہدری کرم داد اکیلا نہیں تھا۔ اس کی تنہائی آباد کرنے کے لیے ایک انگریز عورت لنڈا ہفتے میں ایک دو بار اس کے پاس آتی تھی جس سے اس کی دیرینہ شناسائی تھی۔ لنڈا عموماً رات گہری ہونے کے بعد آتی اور دروازے کی گھنٹی بجانے کے بجائے کھڑکی کے شیشے پر ہلکی سی دستک دیتی۔ کرم داد فوراً سمجھ جاتا' وہ چپکے سے دروازہ کھولتا اور لنڈا کو اپنے کمرے میں لے جاتا۔ یوں مکان میں رہنے والوں کو پتا ہی نہ چلتا کہ لنڈا کب آئی اور کب چلی گئی۔

جن افراد کا کوئی نہ کوئی راز تھا ان میں چوہدری کرم داد بھی شامل تھا۔ اس کا راز یہ تھا کہ اس نے اپنی صحیح آمدنی سے انکم ٹیکس اور سوشل سیکیورٹی کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ دونوں محکموں کی اطلاع کے مطابق اس کے مکان میں صرف پانچ افراد رہائش پذیر تھے۔ جبکہ درحقیقت کرایہ داروں کی تعداد' علی اور راجا کی آمد کے بعد نو ہوگئی تھی۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ جائز اور ناجائز دونوں طرح سے زیادہ کرایہ اپنے کرایہ داروں سے وصول کرتا تھا۔ لیکن انکم ٹیکس کے گوشوارے میں بہت کم کرایہ ظاہر کرتا تھا۔ یہ دونوں ہی باتیں غیر قانونی تھیں اور فراڈ کے ذیل میں آتی تھیں۔ اگر پولیس یا انکم ٹیکس کو اس بات کا علم ہوجاتا تو چوہدری کرم داد بڑی مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ بشیر احمد نے مکینوں کے بارے میں قابلِ اعتبار کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ جب یہ تمام معلومات علی اور راجا کو حاصل ہوئیں تو بشیر احمد کے دعوے کا مطلب بھی ان کی سمجھ میں آیا۔ چوہدری کرم داد کا مکان ایک سو چالیس سال پرانا تھا۔ مگر اس کی خستہ دیواروں کے کان نہیں تھے۔ سال خوردہ ہونے کے باوجود وہ دیواریں اتنی مضبوط تھیں کہ اندر کی بات باہر نہیں جانے دیتی تھیں۔ سب ایک دوسرے کا اعتبار کرتے تھے اور ایک دوسرے کا راز رکھتے تھے' انہیں معلوم تھا کہ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی دوسرے کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تو سب ہی مصیبت میں پڑجائیں گے۔

لیکن کم از کم دو افراد ایسے ضرور تھے جن کا کوئی راز نہیں تھا اور نہ ہی قانون کا کوئی خوف۔ ایک بشیر احمد اور دوسرا صدیق۔ صدیق نچلی منزل کے واحد بیڈروم میں رہتا تھا۔ عمر کوئی پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جس فیکٹری میں بشیر احمد تھے' وہیں وہ بھی کام کرتا تھا۔ اس کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ خاصا بددماغ ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ وہ نسبتاً ایک کم گو' اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا۔ فضولیات میں وقت ضائع کرنا اسے پسند نہیں تھا اس بنا پر وہ لونگ روم یا اوپری منزل میں جمنے والی تاش کی محفلوں میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا تھا اور فرصت کا سارا وقت اردو اخبار پڑھنے یا پھر اپنی بیوی اور ماں کو خط لکھنے میں گزارتا تھا جو گزشتہ ایک سال سے وطن میں تھی۔ پہلے اس کی بیوی اور تینوں لڑکیاں راچڈیل میں ہی تھیں اور شہر کے ایک بارونق علاقے میں رہتی تھیں مگر پھر صدیق نے انہیں وطن بھیج دیا۔ مکان بیچ ڈالا اور چوہدری کرم داد کے مکان میں رہنے لگا۔ اس کا ارادہ تھا کہ سال ڈیڑھ سال اور انگلستان میں رہے گا پھر واپس چلا جائے گا۔

"کیا مستقل طور پر؟" علی نے سوال کیا۔

صدیق نے چائے کا گھونٹ لیا "نہیں بھیا' ابھی اس بارے میں کچھ طے نہیں کیا۔ شاید کچھ عرصے بعد واپس آؤں۔ شاید نہ آؤں۔ میں نے وہاں ایک بہت اچھا کشادہ مکان بنایا ہے اور اپنے بھائی کی شراکت میں ایک بزنس بھی شروع کیا ہے۔ ابھی چونکہ کچھ پیسے کی ضرورت ہے' اس لیے میں نے ایک ڈیڑھ سال اور رکنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جب وہاں کاروبار ذرا جم جائے گا تو واپس چلا جاؤں گا۔"

علی چند لمحے حیرت سے صدیق کو دیکھتا رہا پھر سوالیہ انداز میں بولا "صدیق بھائی' آجکل تو سب ہی لوگ ادھر آنا چاہتے ہیں لیکن آپ واپس جارہے ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟"

"ہے تو۔" صدیق مسکرایا "اور میرا بھی دو سال پہلے تک ایسا کوئی خیال نہیں تھا مگر پھر میں نے طے کیا کہ واپس جانا ہی مناسب رہے گا۔"

"کوئی وجہ تو ہوگی؟" علی کے لہجے میں تجسس تھا۔

"وجہ تو ہے۔" صدیق ایک بار پھر مسکرایا "تاہم یہ الگ بات ہے کہ اس کی اہمیت کا انحصار ہر آدمی کی اپنی سوچ پر ہے۔ کچھ لوگ اسے کوئی اہمیت نہیں دیں گے اور ہر طرح کی صورتِ حالات کو طوعاً و کرہاً یا بخوشی قبول کرلیں گے جب کہ کچھ لوگ ایسا نہیں کریں گے اور میرا خیال ہے کہ میں انہی میں سے ہوں۔" صدیق رک کر تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر کہنے لگا "دراصل میں یہاں کے ماحول سے ڈر گیا ہوں۔ میں یہاں برسوں سے ہوں۔ پہلے میں جن باتوں کا تصور تک نہیں کرسکتا تھا' آج وہ میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ میں نے حالات کو پل پل کروٹ بدلتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہماری نوجوان نسل یہاں کیا کررہی ہے۔ اس کی سوچ' اس کا رویہ۔ میں بس اسٹاپ کے آس پاس چودہ چودہ سال کی نوجوان ایشیائی لڑکیوں کو انتہائی بے ہودہ انداز میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ لپٹتے چپٹتے اور چومتے چاٹتے دیکھتا ہوں۔ میں نوجوان لڑکوں کو

پارک میں چرس اور ہیروئن کا نشہ کرتے دیکھتا ہوں' تب مجھے ڈر لگتا ہے۔ میرا ایک واقف ہے۔ اس کا لڑکا ایڈز میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ ایک اور واقف کار ہے' اس کی لڑکی شادی سے چند دن پہلے ایک غیر مسلم کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس نوعیت کی کتنی ہی دل آزار کہانیاں میرے علم میں آئیں پھر یوں ہوا کہ میں نے اپنی چھوٹی لڑکی کو جس کی عمر بارہ سال ہے' ایک دن بازار میں دیکھا حالانکہ اس وقت اسے اسکول میں ہونا چاہیے تھا۔ تشویش کی دوسری بات یہ تھی کہ اس نے لپ اسٹک لگا رکھی تھی جبکہ میرے علم کے مطابق اس کے پاس لپ اسٹک نہیں تھی۔ تو پھر اس نے لپ اسٹک کب لگائی اور کیوں؟ تب میں مزید ڈرا۔"

"اور صرف اس بنا پر آپ نے واپسی کا فیصلہ کرلیا؟" علی نے سوال کیا۔

"نہیں۔ اور بھی کئی اسباب ہیں۔ دراصل کئی مختلف وجوہ نے مل کر مجھے فیصلہ کرنے پر مجبور کیا۔" صدیق نے رک کر لمحہ بھر غور کیا "ایک شام یوں ہوا کہ ہم سب گھر میں تھے۔ میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ میری تینوں بیٹیاں ٹی وی دیکھ رہی تھیں جس پر ایسٹر کے بارے میں کوئی پروگرام چل رہا تھا۔ میری بیوی نے عیسائیت اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ میں نے خاموشی سے ان کی باتیں سنیں اور چند منٹ کی گفتگو کے بعد منکشف ہوا کہ میری بیٹیوں کو کرسمس' ایسٹر' فادرس ڈے اور مدرس ڈے کے بارے میں جتنی معلومات ہیں' اتنی اپنے دین کے بارے میں نہیں ہیں۔ اس رات میں نے دیر تک اس مسئلے پر غور کیا اور انجام کار واپسی کا فیصلہ کرلیا۔"

"آپ کی بیوی رضامند ہوگئی؟" علی نے پوچھا۔

"وہ بہت خوش ہوئی۔" صدیق نے مسکرا کر کہا "یہاں وہ کبھی خوش نہیں رہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو بہت پہلے وہ واپس چلی جاتی۔"

"اور آپ کی لڑکیوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا؟"

"نہیں۔" صدیق نے سگریٹ جلائی "دراصل میری لڑکیاں بری نہیں بلکہ بہت اچھی ہیں۔ ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مشرقی لڑکی میں ہوتی ہیں۔ بس یہ ہے یہاں وہ اسکول جاتی تھیں' ٹی وی دیکھتی تھیں اور اپنی سہیلیوں کے رنگ ڈھنگ دیکھتی تھیں اور ان سے متاثر ہوتی تھیں۔ خارجی ماحول کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہوتا ہی ہے نا۔ میری لڑکیاں بھی اسکول میں جو کچھ پڑھ رہی تھیں' وہ سیکھ رہی تھیں۔ یہ بالکل فطری بات ہے۔ اس میں ممکن ہے کہ کچھ میری اور میری بیوی کی کوتاہی بھی رہی ہو۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ اکثر ماں باپ دولت جمع کرنے اور اپنی دیگر دلچسپیوں میں اتنا گم ہوجاتے ہیں کہ بچوں پر پوری توجہ نہیں دے پاتے اور اس بنا پر کبھی کبھی بات بگڑ جاتی ہے۔" صدیق نے رک کر کش لیا پھر اضافہ کیا۔ "میری یہ تمام باتیں شاید تمہیں الجھن میں مبتلا کررہی ہوں کیونکہ یہ تصویر کا صرف ایک اور بہت ہی ناخوش گوار رخ پیش کررہی ہیں مگر ایسا نہیں ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ خوب صورت ہے۔ اس ملک میں بے شمار گھرانے ہیں جہاں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے' کوئی الجھن نہیں ہے۔ ان گھروں کی چہار دیواری میں مشرق کی موجودگی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ دراصل اس ملک میں ان لوگوں کو جنھیں اپنی قدریں عزیز ہیں' بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ شاید میں احتیاط کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں کرسکا تھا اس لیے ڈر گیا اور واپس جانے کا فیصلہ کرلیا لیکن یہ فیصلہ میرا ہے اور صرف میرے لیے ہے۔ میں اوروں کو نصیحت نہیں کررہا کہ وہ بھی واپس چلے جائیں۔ وہ شوق سے یہاں رہیں مگر یہ کوشش ضرور کریں کہ اپنی پہچان نہ مٹنے پائے۔"

"لیکن اپنے ملک کے حالات تو...." علی بات پوری کیے بغیر چپ ہوگیا۔

"بہت خراب ہیں۔" صدیق مسکرایا "اور یہ بڑی افسوس ناک بات ہے۔ یہ لوٹ مار' ڈکیتی' رشوت' غبن اور فساد وغیرہ ہمارے لیے ایک بدنما داغ سے کم نہیں لیکن کیا ہمیں امید کا دامن چھوڑ دینا چاہیے۔"

"نہیں۔" علی نے چند لمحے بعد کہا "امید بھی نہ رہے تو پھر کیا بچے گا۔ لیکن یہ بتایئے کیا آپ کی لڑکیاں وہاں خوش رہیں گی؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا' صرف امید کرسکتا ہوں کہ وہ وہاں خوش رہیں گی۔" صدیق نے جواب دیا "تاہم میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں اپنی رائے اور فیصلہ بچوں پر مسلط کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ابھی وہ کم عمر اور ناتجربہ کار ہیں' اس لیے ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا میری ذمے داری ہے۔ ایک بار ان کی شادیاں ہوجائیں تو پھر وہ خود مختار ہوں گی۔ اگر یہاں آنا چاہیں گی تو میں خود انہیں لے کر آؤں گا۔ اس بنا پر صرف میں نے ایک مکان بیچا ہے۔ ایک ابھی میرے پاس ہے جو کرائے پر اٹھا ہوا ہے۔ اگر میری لڑکیاں یہاں آئیں تو انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"تو گویا آپ نے ہر پہلو سے منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔" علی نے مسکرا کر کہا۔

○☆○

چوہدری کرم داد کی واپس پانچویں دن ہوئی۔

شام کا وقت تھا جب علی اور راجا اس کے سامنے پیش ہوئے۔ چوہدری کرم داد اپنے کمرے میں صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ سامنے ٹیبل پر بیئر کا گلاس رکھا تھا۔ ساتھ میں نمکین مونگ پھلیاں بھی تھیں۔ ایش ٹرے میں ایک سگریٹ بھی سلگ رہی تھی۔ چوہدری کرم داد ایک قدرے پستہ قد مگر جسیم آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور ہونٹ موٹے تھے اور رنگ گہرا سانولا' بادی النظر میں وہ ایشیائی کم اور افریقی زیادہ نظر آتا تھا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے کھچڑی بال تھے۔ اس نے ایک تہمد باندھ رکھی

تھی اوپر بنیان تھی چونکہ بنیان الٹی ہوئی تھی لہٰذا اس کی بھاری بھرکم سیاہ توند کسی بڑے فٹ بال کی طرح صاف نظر آرہی تھی۔ جب علی اور راجا نے اسے سلام کیا تو وہ باچھیں پھیلا کر مسکرایا' توند پر ہاتھ پھیرا پھر مسکرا کر خوش دلی سے بولا۔ "بیٹھو۔"

راجا اور علی ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ بشیر احمد نے ہیٹر کے پاس پڑی ہوئی کرسی سنبھالی۔ چوہدری کرم داد نے گلاس اٹھا کر ایک بڑا گھونٹ بھرا۔ مونگ پھلی کے دو تین دانے منہ میں ڈالے پھر سگریٹ کا کش لے کر بولا۔

"تو یہی ہیں وہ دونوں؟"

"ہاں۔" بشیر احمد نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

"تمہارے آدمی ہیں یہ بشیر صاحب؟" چوہدری کرم داد نے سوال کیا۔

بشیر احمد نے خود بھی ایک سگریٹ جلائی "نہیں' خیر ایسا تو نہیں ہے۔ بس اتنا ہے کہ راجا کے چچا سے کسی زمانے میں میری کچھ واقفیت تھی۔ اسی بنا پر یہ دونوں میرے پاس آئے ہیں اور چونکہ اب آہی گئے ہیں تو انہیں میرا ہی آدمی سمجھ لیجئے۔"

"یہ تو بڑی مشکل ہے۔" چوہدری کرم داد نے خود کلامی کے انداز میں کہا "میرے گھر میں پہلے ہی زیادہ افراد ہیں اور چھپ کر رہ رہے ہیں اور اب یہ دونوں بھی؟ اگر کبھی "کتوں" کو خبر ہو جائے یا کوئی سؤر کا پتر مخبری کردے تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ خیر۔۔۔" چوہدری کرم داد نے گلاس اٹھا کر گھونٹ لیا پھر راجا اور علی کی طرف دیکھا "کس طرح آئے تم دونوں یہاں۔ پاسپورٹ جعلی تھا یا اصلی یا بنا پاسپورٹ کے ہی آئے ہو؟"

"جی پاسپورٹ تو اصلی ہے' صرف ویزا جعلی تھا۔" علی نے کہا۔

"کون لوگ لائے تھے؟"

علی نے راجا کی طرف دیکھا۔ راجا نے علی کی طرف پھر علی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا۔ ایک بار پھر پوری کہانی دہرائی۔ راستے کے مصائب اور مشکلات اور بے سروسامانی اور خدشات کا ذکر کیا گیا۔ جب وہ چپ ہوا تو معمول کے مطابق کرم داد نے بھی بار بار دہرائی گئی نصیحتوں اور ہدایتوں کو دہرایا۔ ملک کے خراب حالات کا ذکر کیا۔ محتاط رہنے کی تاکید کی پھر بشیر احمد کی طرف دیکھا۔

"تو یہ دونوں یہیں رہیں گے؟"

"ہاں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔"

چوہدری کرم داد نے اپنی گول سیاہ توند پر ہاتھ پھیرا۔ چھوٹی سی ڈکار لی پھر مسکرائے "بھئی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اپنے ہی وطن کے ہیں دونوں' مدد تو کرنا ہی پڑے گی۔ اوپر والے خالی کمرے میں یہ دونوں رہ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے' اس میں ضرورت کی سب چیزیں ہیں مثلاً کمبل وغیرہ۔۔۔۔"

"کمبل تو ہیں۔" یکایک علی نے کہا "مگر وہ تو بہت بوسیدہ اور گندے ہیں۔ بڑی بدبو آتی ہیں ان میں سے۔۔۔۔"

چوہدری کرم داد ہنسا "اچھا بدبو آتی ہے۔ بھئی کمال ہے۔ خیر چلو کوئی بات نہیں۔ میں نئے لحاف منگوا دیتا ہوں اور ہاں۔۔۔۔" چوہدری کرم داد نے رک کر بشیر احمد کی طرف دیکھا "آپ انہیں ساری باتیں سمجھا دیجئے گا۔ خاص طور پر کرائے کے بارے میں۔"

"ٹھیک ہے' میں سمجھا دوں گا۔" بشیر احمد نے کہا۔

چوہدری کرم داد کوئی چونتیس پینتیس سال قبل برطانیہ آیا تھا۔ جب وہ ہیتھرو ائرپورٹ پر پی آئی اے کے جہاز سے اترا تھا تو اس کی جیب میں صرف پانچ پاؤنڈ تھے۔ راچڈیل پہنچ کر اس نے کپڑے کی ایک مل میں فلور سوپر کے طور پر کام شروع کیا کیونکہ اسے اور کوئی کام آتا ہی نہیں تھا۔ ہفتہ پورا ہوا تو اسے آٹھ پاؤنڈ تنخواہ ملی۔ اب پینتیس سال گزر چکے تھے اور پہلی تنخواہ کے طور پر صرف آٹھ پاؤنڈ وصول کرنے والا چوہدری کرم داد اب چار مکانوں کا مالک تھا۔ تین بینکوں میں اس کا اکاؤنٹ تھا۔ وطن میں کوئی سو ایکڑ زمین اور کئی مکانات تھے۔ یہ دولت اور جائداد چوہدری کرم داد نے بڑے جتن اور جوڑ توڑ کے بعد پیسہ پیسہ جوڑ کر حاصل کی تھی۔ اس نے برسوں فیکٹریوں میں بارہ بارہ گھنٹے اور ساتوں دن کام کیا تھا۔ روپیہ بلیک کرنے کا دھندا کیا تھا اور کچھ ایسے ذرائع بھی اختیار کئے تھے جو معیوب' غیر اخلاقی اور قانون کی نظر میں قابل گرفت تھے۔ مثلاً کسی زمانے میں اس نے خفیہ طور پر چرس بھی بیچی تھی مگر اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ روپے کا حصول مقدم تھا۔ جہاں سے ملے' جیسے ملے' ملنا چاہیے۔ اس کے تمام کرایہ داروں اور واقف کاروں کے حلقے میں ایک بات اکثر بطور طنز کہی جاتی تھی یہ کہ چوہدری کرم داد پیسے کے معاملے میں اوروں کے ساتھ کیا رعایت کرے گا' وہ تو خود اپنے ساتھ رعایت نہیں کرتا۔ دراصل چوہدری کرم داد اخلاقی اور تہذیبی قدروں کا کچھ زیادہ قائل نہیں تھا۔ دوستی' رشتے' تعلقات اس کی نظر میں فروعی تھے۔ اپنی ذات مقدم تھی۔ وہ صرف اپنے آپ سے محبت کرتا تھا مگر چونکہ وہ ایک زیرک اور مصلحت کوش آدمی تھا اس لیے اس کی شخصیت کے دو روپ خود بخود بن گئے تھے۔ اندر سے وہ ایک کٹھور' بے حس اور موقع پرست آدمی تھا۔ مفاد کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا مگر ظاہری طور پر وہ ایک خوش مزاج' ہمدرد اور فراخ دل آدمی تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک مہربان مسکراہٹ نظر آتی۔ طرزِ عمل سے خلوص کا اظہار ہوتا اور گفتگو یوں کرتا گویا برسوں کی گہری جان پہچان ہو جبکہ درحقیقت وہ کسی کا دوست نہیں تھا۔ اپنے مفاد کے لیے وہ ہر کام کرتا تھا۔ خاص طور پر اگر پیسے کا معاملہ ہو تو اپنے قریب ترین عزیز یا دوست کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے میں بھی اسے کوئی عار نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بشیر احمد اور صدیق' علی اور کچھ دوسرے واقف کار اکثر کہتے

تھے کہ وہ چوہدری کرم داد کو جانتے تو ضرور ہیں لیکن پہچانتے نہیں ہیں۔

"سالے کی آنکھ میں سؤر کا بال ہے۔" یہ بات بشیر احمد نے اس وقت کہی جب وہ چوہدری کرم داد سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں پہنچے۔

علی اور راجا نے حیرت سے انہیں دیکھا "کیا مطلب؟"

"اس نے خاص طور پر کرائے کا ذکر کیا تھا۔ تم اس کا مطلب سمجھے؟" بشیر احمد نے خشک لہجے میں کہا۔

"نہیں تو۔"

"تم اسے نہیں جانتے مگر رفتہ رفتہ کسی حد تک اسے جان جاؤ گے۔" بشیر احمد نے بیزاری سے کہا اور پیکٹ سے ایک سگریٹ برآمد کی "دیکھو بات یہ ہے کہ ایک کرائے دار سے وہ عام طور پر بیس پاؤنڈ ہفتہ کرایہ لیتا ہے اگر دو یا تین افراد ایک کمرے میں رہتے ہوں تو۔ تنہا ایک کمرے میں رہنے والے سے تیس پاؤنڈ۔ تم دونوں اگرچہ ایک ہی کمرے میں رہو گے مگر تمہارا کرایہ پچیس پچیس پاؤنڈ ہو گا۔"

"یعنی پانچ پانچ پاؤنڈ زیادہ؟" راجا نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں۔"

"مگر کیوں؟"

"میں نے کہا نا' سؤر کا بال ہے اس کی آنکھوں میں۔" بشیر احمد کے لہجے میں کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی "تم دونوں غیر قانونی ہو۔ وہ تمہاری اس مجبوری کا فائدہ اٹھائے گا اور پانچ پانچ پاؤنڈ زیادہ وصول کرے گا۔ اس کا جواز اس کے پاس یہ ہے کہ وہ تمہیں اپنے گھر میں پناہ دے گا۔ بہت ہی خود غرض آدمی ہے وہ۔"

"گویا وہ ہماری غیر قانونی حیثیت کا جرمانہ وصول کرے گا؟" علی حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"ہاں۔"

"مگر یہ تو کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ ہم لوگ تو اس کے وطن کے ہیں۔"

بشیر احمد تلخی سے مسکرایا "اسے ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ ہمدردی اور مدد تو کرتا ہے مگر اس کی قیمت بھی وصول کرتا ہے۔ یہ ساری جائداد اور بینک بیلنس جو اس نے بنایا ہے' اسی طرح بنایا ہے۔ بہت ہی کمینہ آدمی ہے وہ۔" بشیر احمد نے رک کر سگریٹ کا ٹوٹا ایش ٹرے میں بجھایا "زیادہ کرایہ تو خیر تم دونوں کو دینا ہی پڑے گا اور کوئی چارہ نہیں لہٰذا سردست اس کی فکر نہ کرو۔ تم دونوں کو ملازمت مل جائے گی اور آمدنی کی باقاعدہ صورت نکل آئے تو پھر اس بارے میں بھی کچھ سوچیں گے۔"

"آپ نے کسی چوہان کا ذکر کیا تھا؟" راجا نے پوچھا۔

"ہاں' میں نے اس سے بات کی تھی۔ سالا ایک نمبر کا حرامی ہے وہ بھی۔" بشیر احمد نے تلخی سے کہا "کچھ نہ کچھ فائدہ وہ بھی ضرور اٹھائے گا مگر نوکری دلانے میں مدد کرے گا۔ اس کی بہت واقفیت ہے۔ اصل میں یہاں ایسے کئی کارخانے' ویٹر ہاؤس اور اسٹور ہیں جو غیر قانونی طور پر کام کرنے والوں کو کام دے دیتے ہیں اور چوہان ایسے اسٹوروں اور کارخانوں سے واقف ہے۔ تم لوگ اطمینان سے بیٹھو اور زیادہ پریشان مت ہو۔ میں ذرا چائے بناتا ہوں۔ کچھ کھا پی لیں پھر چوہان کے پاس چلتے ہیں۔ اس نے شام کو ملنے کے لیے کہا تھا۔"

بشیر احمد اٹھ کر کچن کی طرف چلے گئے۔

○☆○

دیپک پٹیل چند لمحے پنسل اپنی انگلیوں میں نچاتا رہا اور غور سے علی کو دیکھتا رہا پھر اس نے زور سے سانس لی اور چوہان کی طرف دیکھا "تو یہی ہیں' کیا نام بتایا' آصف علی؟"

"ہاں۔" چوہان نے کہا۔

"اصل میں بھائی چوہان' کیا ہے کہ آج کل خطرہ بہت ہے۔ آئے دن چھاپے پڑتے ہیں اور پھر میرے پاس تو پہلے ہی سے تین چار غیر قانونی طور پر کام کرنے والے موجود ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" چوہان نے کہا "یہ ابھی ابھی آئے ہیں اور انہیں کام کی سخت ضرورت ہے۔"

دیپک پٹیل نے غور سے علی کو دیکھا "کب آئے ہو تم؟"

"کوئی آٹھ دن ہوئے۔" علی نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

"سلائی کا کام جانتے ہو؟"

"نہیں مگر میں سیکھ سکتا ہوں۔" علی نے اپنی آواز میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"وہ تو خیر بعد کی بات ہے۔ ابھی کیا کام کر سکتے ہو تم؟"

علی نے تھوک نگلا "جی جو کام بھی آپ دیں گے' میں پوری محنت اور ایمانداری سے کروں گا۔ آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

"خیر محنت اور ایمانداری تو اچھی بات ہے۔ اگر کام چوری کرو گے تو ظاہر ہے کہ زیادہ دن کام نہیں کر سکو گے۔" دیپک پٹیل نے کہا "مگر اصل مسئلہ یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم یہاں غیر قانونی طور پر آئے ہو اور کام بھی غیر قانونی طور پر کرو گے اور تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ اس میں کتنا جھنجٹ ہے۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو صرف تم نہیں' میں بھی مشکل میں پڑوں گا.... بڑی مصیبت ہے بھائی...." آخری جملہ اس نے چوہان کی طرف گھوم کر کہا "لوگ چلے آتے ہیں غیر قانونی طور پر یا سیاسی پناہ حاصل کر کے' کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو تفریحی ویزے پر آتے ہیں لیکن میعاد پوری ہونے پر جاتے نہیں بلکہ غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ لوگ کام مانگنے آتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ' ہم لوگ کیا کریں۔ یہ سوچ کر کام دے دیں کہ اپنے بھی بھائی بند ہیں تو خود بھی مشکل میں پڑیں' بڑی مصیبت

ہے۔"

علی خاموش کھڑا رہا۔ اسے کوفت کے ساتھ ساتھ پشیمانی اور ذلت کا احساس گھیرے ہوئے تھا۔ زندگی میں اتنا بے قیمت اس نے کبھی اپنے آپ کو محسوس نہیں کیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بھکاری ہے اور سرِبازار کھڑا ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھیک مانگ رہا ہے.... ایک پیسہ دے دے بھائی۔ دو دن سے بھوکا ہوں' بالکل بے سہارا ہوں' مجبور اور بے کس ہوں' کوئی ٹھکانا نہیں میرا۔ غریب کی صدا سن لو' تمہارے بچے جئیں' تمہارا اقبال سدا سلامت رہے۔ بس ایک پیسہ دے دو' اوپر والے کے نام پر.... اس کا دل ایک لمحے کے لیے چاہا کہ فوراً دیپک پٹیل کے دفتر سے نکل جائے۔ سیدھا گھر پہنچے' بوریا بستر باندھے اور اپنے وطن واپس چلا جائے۔ وطن جہاں اس کا گھر ہے' جس کے آنگن میں شریفے کا ایک پیڑ ہے جس میں بڑے بڑے' سفید گودے والے میٹھے میٹھے شریفے لگتے ہیں۔ وہ گھر بے شک بڑا شکستہ ہے۔ برسات میں اس کی چھت سے پانی ٹپکتا ہے اور سال خوردہ دیواروں کی خستہ اینٹوں پر کائی جمتی ہے۔ اس گھر میں اسے دال روٹی کے سوا کچھ نہیں ملتا مگر وہ بہرحال اس کا گھر ہے۔ وہ گھر اسے پہچانتا ہے اور وہ اس گھر کو جانتا ہے۔ درمیان میں غیریت اور تکلف کا کوئی پردہ نہیں ہے۔ اس گھر میں اس کی اماں ہیں' خالہ اور بہن بھائی ہیں۔ اس گھر میں امن ہے' سکون اور محبت....

مگر کیا وہ واپس جاسکتا ہے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنے دل کی تیز دھڑکن سنی..... نہیں' وہ واپس نہیں جاسکتا۔ وہ تو غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوا ہے' واپسی کا سفر کس طرح کرے گا۔ اور پھر وہ جو ایک خطیر رقم اس نے یہاں پہنچنے کے لیے خرچ کی ہے' اس کا کیا ہوگا' نہیں' وہ واپسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب تو یہیں رہنا ہوگا اور ہر طرح کی صورتِ حال کو برداشت کرنا ہوگا۔ چنانچہ وہ چپ رہا اور دیپک پٹیل کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا "بھائی چوہان' تم تو جانتے ہو۔ میں اسٹاک پورٹ میں تھا اور اوپن مارکیٹ میں اسٹال لگایا کرتا تھا۔ اس سے پہلے فیکٹری میں کام کرتا تھا پھر راچڈیل آیا اور ایک چھوٹی سی دکان سے شروعات کی۔ دن رات محنت کی' ایک ایک پیسہ سوچ سمجھ کر خرچ کیا۔ آج میں اس فیکٹری اور ایک اسٹور کا مالک ہوں۔ میں اپنے ایشین بھائیوں کی مجبوری کو سمجھتا ہوں اور ان کی مدد بھی کرتا ہوں لیکن افسوس وہ ہماری پرابلم کو نہیں سمجھتے۔ کبھی کبھی کوئی ایسا آدمی بھی آجاتا ہے جو دھوکا دیتا ہے۔ اب یہی دیکھو' کوئی تین ماہ پہلے ایک آدمی آیا تھا۔ اسائلم پر تھا۔ میں نے ہمدردی کے ناتے کام دے دیا۔ جب وہ مقدمہ ہارا اور واپس جانے لگا تو جاتے جاتے ہاتھ صاف کرگیا۔ پورے دو ہزار پاؤنڈ کی چپت لگائی تھی اس نے۔ بڑی مصیبت ہے بھائی۔" دیپک پٹیل نے رک کر زور سے سانس لی۔

"تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں بھی ایسا ہی آدمی ہوں۔" علی نے معاذرانہ تلخی سے کہا۔

"نہیں' میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ مگر کون جانتا ہے۔" اس نے رک کر چوہان کی طرف دیکھا "بھائی چوہان' تم نے انہیں پوری بات بتادی ہے؟"

"تم فکر نہ کرو' میں بتادوں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے' تم کل صبح سے کام پر آجاؤ۔ نو بجے سے آٹھ بجے تک گیارہ گھنٹے کام کرنا ہوگا۔ فی الحال میں ایک پاؤنڈ پچیس پنس فی گھنٹے کے حساب سے تنخواہ دوں گا۔ منظور ہے۔"

علی نے اثبات میں سرہلایا۔

دیپک پٹیل نے زور سے سانس لی "کل صبح میں تمہیں بتاؤں گا کہ کیا کام کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے کیونکہ ہوشیاری اور احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ بڑی مصیبت ہے بھائی۔"

علی سست قدموں سے چلتا ہوا فیکٹری سے باہر آیا۔ چوہان کی گاڑی درمیانی گلی میں کھڑی تھی۔ اس نے علی کو گھر تک پہنچانے کی پیش کش کی مگر علی نے شکریے کے ساتھ انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ گھر زیادہ دور نہیں' وہ پیدل ہی چلا جائے گا۔ چوہان اپنی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ علی نے کوٹ کے بٹن اچھی طرح بند کیے' ہاتھ جیبوں میں ڈالے اور آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنا شروع کیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ سڑک سیدھی ٹاؤن سنٹر کو جارہی ہے۔ ٹاؤن سنٹر پہنچ کر وہ اس سڑک کو تلاش کرلے گا جو اس کی رہائش گاہ کی طرف جاتی ہے۔ گزشتہ آٹھ دن میں وہ تین چار مرتبہ بشیر احمد کے ساتھ ٹاؤن سنٹر آچکا تھا اور راستوں کو کافی حد تک پہچان گیا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ گھر پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ تاہم یہ بات اس کے ذہن میں واضح نہیں تھی کہ اس نے چوہان کے ساتھ جانے سے کیوں انکار کیا تھا اور پیدل چل کر گھر جانے کو کس لیے ترجیح دی تھی۔ شاید وہ کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا تھا۔ شاید کچھ وقت وہ خود اپنے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ دراصل دیپک پٹیل کی باتوں نے اسے شکستہ خاطر کردیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ ملازمت کے لیے نہیں بلکہ خیرات مانگنے نکلا ہو۔ دیپک پٹیل کے لہجے میں رعونت اور تحقیر تھی اور وہ اس کے سامنے چپ چاپ کھڑا رہا تھا کیونکہ وہ جواب دینے اور سرگراں ہونے کی حیثیت میں نہیں تھا اور ایک دیپک پٹیل ہی نہیں' اس سے پہلے چوہان اسے ایک اور فیکٹری میں لے گیا تھا۔ وہاں بھی اس نے اسی اہانت آمیز رویے کا سامنا کیا تھا۔ فیکٹری کے مالک ابراہیم کنگریا نے بھی دیپک پٹیل کے لہجے میں ہی گفتگو کی تھی۔ چوری چھپے کام کرنے والوں کو ہدفِ تنقید بنایا تھا اور اس کے غیر قانونی داخلے کے بارے میں متعدد سوالات کیے تھے اور پھر یہ کہہ کر کام دینے سے انکار کردیا تھا کہ سرِدست وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ اگر ہوسکا تو کچھ دن بعد کوئی کام دے دے گا۔

علی آہستہ آہستہ چلتا رہا۔

شمال کی جانب سے آنے والی ہوا میں تلوار کی کاٹ تھی۔ شدید سردی کے باعث اس کا بدن کسی پتے کی طرح ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ کان سن ہو گئے تھے اور ناک کی پھننگ پر لگتا تھا' کوئی برف کی ڈلی رکھی ہے۔ ہوا کے مدھم مگر یخ بستہ جھونکے جب اس کے چہرے سے ٹکراتے تو اسے خون اپنی رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوتا اور آنکھوں میں آنسو آجاتے مگر اس کا دھیان نہ تو شدید سردی کی طرف تھا' نہ برفیلی ہوا کی طرف' اس کا دھیان تو اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ مختلف اور بے ربط خیالات اس کے دماغ میں چکراتے پھر رہے تھے۔ ایک عجیب اور ناقابلِ فہم بے یقینی اور شش و پنج کی کیفیت اس پر طاری تھی۔ جو کچھ ہوا تھا' جو کچھ ہو رہا تھا' کیا یہ سب درست ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کہیں کوئی بات غلط ہے مگر اس کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچ رہی ہے۔ اگر کوئی بات واقعی غلط ہے اور باعثِ پریشانی ہوگی تو وہ کیا بات ہے۔ مگر وہ کچھ طے کرنے سے قاصر تھا۔ پھر اس کا دھیان ایک پاؤنڈ پچیس پنس فی گھنٹا اجرت کی طرف گیا۔ ایک پاؤنڈ پچیس پنس' اگر وہ گیارہ گھنٹے روزانہ اور چھ دن کام کرے گا تو چھیاسٹھ گھنٹے بنے۔ گویا اسے بیاسی پاؤنڈ پچیس پنس ہر ہفتہ ملیں گے۔ غیر ارادی طور پر اس کے ذہن نے بیاسی پاؤنڈ کو اپنے ملک کی کرنسی میں تبدیل کیا تو اسے عجیب سا اچنبھا ہوا۔ یہ تو چار ہزار روپے سے زیادہ بن جاتے ہیں۔ چار ہزار روپے فی ہفتہ' گویا سولہ ہزار روپے سے زیادہ ہر ماہ۔ یہ تو خاصی بڑی رقم ہے۔ وطن میں تو بہ مشکل دو ڈھائی ہزار روپے کما پاتا تھا۔ کہاں دو ڈھائی ہزار روپے ماہانہ اور کہاں چار ہزار روپے ہفتہ۔ یہ خیال بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس کے دل میں ایک جوش آمیز مسرت کا احساس پیدا ہو گیا مگر پھر فوراً ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ بے شک چار ہزار روپے ہفتہ بڑی رقم ہے لیکن یہ کیسے پتا چلے گا کہ یہ کافی بھی ہے یا نہیں۔ ابھی تو اسے اس ملک کے اخراجات کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ صرف اتنا ہی جان پایا ہے کہ ڈبل روٹی کی قیمت کیا ہے۔ دودھ کی بوتل کتنے میں آتی ہے اور سبزی کس بھاؤ ملتی ہے۔ اور اسے صرف ڈبل روٹی' دودھ اور آلو گوبھی ہی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور بھی اَن گنت اخراجات ہوں گے پھر قرضہ بھی ہے اور کرایہ.... اسے نہ جانے کیوں یکایک یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی دلدل کے کنارے کھڑا ہے۔

جب وہ ٹاؤن سنٹر کے قریب پہنچا تو معاً اس کی نظر ایک لڑکی اور ایک لڑکے پر پڑی جو ایک بند دکان کے سائبان کے نیچے کھڑے تھے۔ لڑکی نے کھلے گلے کے بلاؤز کے ساتھ سیاہ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ چمکیلے' گھنگھریالے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ماتھے پر ننھی سی بندیا تھی جب کہ لڑکا خلیے سے مسلمان نظر آرہا تھا۔ لڑکی کے دونوں ہاتھ لڑکے کی گردن میں حمائل تھے۔ لڑکے کا ایک ہاتھ لڑکی کی کمر میں اور دوسرا اس کے سینے پر تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو اس طرح چوم رہے تھے جیسے انہیں آس پاس کی کچھ خبر ہی نہ ہو مگر حقیقتاً اب ایسا نہیں تھا۔ جب علی ان کے قریب سے گزرا تو انہوں نے محسوس کرلیا کہ وہ انہیں بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے معاً ہونٹ الگ کئے اور گردن گھما کر علی کی طرف دیکھا۔ علی شرمندہ ہو کر عجلت میں آگے بڑھا۔ تبھی اس کے کانوں میں لڑکی کی آواز آئی۔

"باسٹرڈ۔"

پھر لڑکے کی آواز سنائی دی "سوائن۔"

پھر دونوں زور سے ہنسے۔ علی کو ان کی ہنسی کی آواز اپنے رگ و پے میں بجلی کے کرنٹ کی طرح دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خجالت اور شرمندگی کے باعث اسے یوں لگا جیسے اس کے جسم پر غیر مرئی چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ وہ گردن جھکائے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

شدید سردی کی بنا پر ٹاؤن سنٹر میں کچھ زیادہ رونق نہیں تھی۔ دکانیں اور بڑے اسٹور کھلے ہوئے تھے مگر کسی بھی اسٹور میں وہ رش نظر نہیں آرہا تھا جو عموماً جمعہ اور سنیچر کو نظر آتا ہے۔ تھری ڈے مارکیٹ بھی بند تھی۔ علی خالی خالی نظروں سے گرد و پیش کا نظارہ کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ بوٹس' برٹش ہوم اسٹور' مدر کیئر اور ٹیسکو۔ علی کو انگلینڈ کے سپر اسٹور بہت اچھے لگے تھے۔ ان کے وسیع شوکیس' صفائی اور سجاوٹ اور پھر یہ کہ ٹیسکو وغیرہ میں ضرورت کی ساری اشیا ایک ہی جگہ مل جاتی تھیں۔ چند ایک اسٹور تو ایسے تھے جہاں سبزی اور ڈبل روٹی سے لے کر بچوں کے کپڑے' جوتے' ادویات اور حتیٰ کہ باغبانی کا سارا سامان اور پودے اور سیب اور ناشپاتی کے درخت تک مل جاتے تھے (علی نے ایسا ہی ایک اسٹور چند دن بعد دیکھا تھا اور اسے بہت اچھا لگا تھا) لوگوں کو مختلف اشیا کے حصول کے لیے اِدھر اُدھر بھٹکنے اور مختلف دکانوں میں جھانکنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ایک ہی اسٹور میں ساری اشیا خریدیں اور گھر چلے گئے۔ علی نے یہ بھی دیکھا تھا کہ تقریباً ہر شے پر قیمت کی چٹ چسپاں ہوتی ہے اور وہ قیمت مناسب و موزوں ہوتی ہے لہٰذا کوئی مول تول نہیں کرتا۔ گاہک اپنی مطلوبہ اشیا لے کر کاؤنٹر پر جاتا ہے اور قیمت ادا کر دیتا ہے۔

یکایک علی کی سانس تقریباً رک گئی۔

انگلستان میں اگرچہ اسے صرف آٹھ دن ہوئے تھے اور اس عرصے میں اسے کئی باتوں سے خوف آیا تھا مگر جتنا خوف اسے پولیس کو دیکھ کر آیا تھا' اتنا کسی اور شے سے نہیں آیا تھا۔ اور اس وقت اس کی سانس تقریباً رک جانے کا سبب یہی تھا کہ سامنے سے ایک پولیس مین چلا آرہا تھا۔ گہری نیلی یونیفارم میں ملبوس بھاری بوٹس جن کی سیاہ پالش چمک رہی تھی۔ ہاتھ میں بیٹن تھا اگرچہ ابھی وہ کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھا اور اس نے علی کو دیکھا بھی نہیں تھا پھر بھی علی کی سانس رکنے لگی۔ دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی۔ وہ

ساکت ہو کر کھڑا رہا اور ہراساں نظروں سے پولیس مین کو دیکھتا رہا۔ ہرچند کہ اسے معلوم تھا کہ پولیس مین اس پر خواہ مخواہ شک نہیں کرے گا کیونکہ اس کے ماتھے پر نہیں لکھا کہ وہ غیر قانونی طور پر برطانیہ میں داخل ہوا ہے لیکن چور کا دل بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اسے اپنا سایہ بھی اپنا دوست نظر نہیں آتا۔ علی کو بھی خواہ مخواہ شک ہو رہا تھا کہ جونہی پولیس مین کی نظر اس پر پڑے گی وہ اسے روک لے گا اور پوچھ گچھ شروع کردے گا۔ کون ہو تم؟ کیا نام ہے؟ کب آئے ہو اس ملک میں؟ پاسپورٹ دکھاؤ۔ اچھا تو تم وہی ہو جس کی ہمیں تلاش تھی۔ چلو پولیس اسٹیشن۔ تو پھر وہ کیا کرے؟ کیسے جان بچائے؟ گزشتہ آٹھ دن میں اسے بار بار تاکید کی گئی تھی کہ قانون کے نمائندوں کی نظر سے ہر حال میں بچنا ہے مگر اب قانون کا ایک نمائندہ ایک خوفناک بھوت کی طرح سامنے موجود تھا اور قدم بہ قدم اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اسے دیکھے' اسے کچھ کرنا تھا۔ اس نے گھبرا کر دائیں بائیں نظر ڈالی' خوش قسمتی سے دو دکانوں کے درمیان ایک پتلی سی گلی نظر آگئی۔ علی پھرتی سے گھوما اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گلی میں داخل ہوگیا۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں تو صرف ایک تصور' صرف ایک خواہش تھی۔ یہ کہ جلد از جلد پولیس مین کی نظروں سے اوجھل ہوجائے چنانچہ وہ اپنی بھاری سانسوں کو سنبھالتا' لپکتا جھپکتا آگے بڑھتا چلا گیا۔

لیکن وہ زیادہ دور نہیں جاسکتا تھا کیونکہ وہ راستوں سے واقف نہیں تھا۔ ایک بار بھٹک گیا تو کیا کرے گا' کہاں جائے گا؟ کیسے گھر پہنچے گا؟ اسے تو اتنی انگریزی بھی نہیں آتی ہے کہ کسی سے اپنے گھر کا راستہ پوچھ سکے۔ مناسب یہی تھا کہ کہیں رک جائے اور پولیس مین کے گزر جانے کا انتظار کرے کیونکہ ٹاؤن سنٹر کے راؤنڈ اباؤٹ سے اپنے گھر پہنچنا اس کے لئے آسان تھا۔ چنانچہ وہ کوڑے کے ایک بڑے ڈرم کی آڑ لے کر کھڑا ہوگیا اور چور نظروں سے سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک ایک لمحہ بھاری تھا' ایک ایک پل یوں گزر رہا تھا جیسے زہر کی بوند بن کر اس کے دماغ پر گر رہا ہو۔ اسے اس ... وقت اپنے آپ پر شدید غصہ آرہا تھا۔ کتنی بڑی حماقت کی ہے۔ کیا ضرورت تھی پیدل چلنے کی۔ اگر چوہان کے ساتھ گھر چلا گیا ہوتا تو اس مصیبت سے دوچار نہ ہونا پڑتا مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ اب تو حماقت ہو ہی چکی تھی۔ لعنت ہے یکایک اس نے اپنے آپ سے کہا اور پلک جھپکائے بغیر سڑک کی طرف گھورتا رہا۔ تین چار منٹ کا انتظار اتنا جان سوز تھا کہ اسے تین چار صدیوں کے برابر محسوس ہوا پھر انجام کار اس نے پولیس مین کو دیکھا' جب پولیس مین آہستہ آہستہ چلتا ہوا گلی کے سامنے سے گزر کے آگے چلا گیا تو علی نے اطمینان کی سانس لی۔

لیکن حواس بحال ہونے اور خوف کا غلبہ کم ہونے میں بہرحال چند منٹ اور لگے پھر وہ اپنی شکستہ ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا گلی سے باہر آیا اور بائیں جانب نظر ڈالی کیونکہ پولیس مین اسی طرف گیا تھا۔ خوش قسمتی سے پولیس مین دور تک کہیں نظر نہ آیا۔ علی نے ایک بار پھر اطمینان کی سانس لی اور چوراہے کی طرف لپکا۔

"سنئے۔"

یہ لفظ علی نے اس وقت سنا جب وہ ایک بڑے اسٹور کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ گردن موڑ کر دیکھا تو اسٹور کے دروازے پر ایک ایشین عورت نظر آئی۔ ستائیس اٹھائیس سال عمر رہی ہوگی۔ آسمانی رنگ کے شلوار سوٹ پر اس نے بھورے رنگ کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر ایک بڑا سفید رومال بہت قرینے سے اس طرح باندھا تھا کہ نہ صرف گردن بلکہ نصف پیشانی بھی مستور ہوگئی تھی۔ صبیح رنگ تھا۔ ستواں ناک اور بڑی بڑی مگر قدرے افسردہ آنکھیں۔ علی کے دل میں یکایک ایک خوش گوار اور طمانیت آمیز احساس نے کروٹ لی۔ اسے عورت کا سراپا ہی نہیں اس کی سادگی بھی اچھی لگی۔ کچھ دیر پہلے اس نے ایک ایشین لڑکی دیکھی تھی جس کی ہر ادا سے مغربی عامیانہ پن ٹپک رہا تھا۔ اب دوسری ایشین اس کے سامنے تھی جس کی شخصیت اور ظاہری روپ مشرقی وقار سے معمور تھا۔ اس نے عورت کے چہرے کو اور اس کے سر کے سفید رومال کو غور سے دیکھا پھر مسکرا کر اس کی طرف بڑھا۔ "آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔"

"جی ہاں۔" عورت کی آواز نرم اور شائستہ تھی۔

"کیا بات ہے؟" علی نے پوچھا۔

"آپ کو زحمت تو ہوگی۔" عورت نے معذرتی لہجے میں کہا۔ "مگر میرے پاس سامان ذرا زیادہ ہے۔ کیا آپ یہ تھیلے ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچانے میں میری مدد کریں گے؟"

علی نے دیکھا زمین پر چار پانچ بڑے بڑے اور وزنی تھیلے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے عورت کی طرف دیکھا۔

"ٹیکسی اسٹینڈ کہاں ہے؟"

"اس طرف۔" عورت نے ہاتھ سے چوراہے کی طرف اشارہ کیا "میں معافی چاہتی ہوں اصل میں میں اپنے بہنوئی کا انتظار کر رہی تھی مگر وہ ابھی تک نہیں آئے۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن اگر....."

"نہیں' نہیں شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا "میں تو اسی طرف جا رہا ہوں۔ چلئے' میں پہنچا دیتا ہوں۔"

"شکریہ۔" عورت نے ممنونیت سے کہا۔

علی نے تین تھیلے جو زیادہ بڑے تھے' اٹھا لیے۔ عورت نے باقی دو تھیلے سنبھالے۔

ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف چلتے ہوئے علی نے ایک بار پھر ذرا غور سے عورت کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر اس کے دل میں ایک

مسرت آمیز احساس نے سر ابھارا۔ گو وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ اس عورت کے سراپا اور شخصیت میں ایسی کیا بات ہے جو اسے اچھی لگی۔ تاہم کوئی بات تھی ضرور شاید اس کے ترشے ہوئے نین نقش، شاید اس کی صبیح رنگت اور یا پھر شاید اس کی شخصیت کا سادہ پن۔ اکثر چہرے حسین ہوتے ہیں اور پہلی ہی نظر میں دل و احساس میں مدوجزر پیدا کرتے ہیں مگر ان سے تصنع کی جھلک بھی نمایاں ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ درمیان میں ایک غیر مرئی پردہ پڑا ہے۔ رنگین اور نظروں کو دھوکا دینے والا جس کے باعث وہ چہرہ دلکش نظر آرہا ہے۔ اگر پردہ درمیان سے ہٹ جائے تو شاید وہ چہرہ اتنا دلکش اور دلفریب نظر نہ آئے مگر اس عورت کے چہرے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کا چہرہ خوب صورت تھا اور محسوس ہوتا تھا کہ درمیان میں کوئی پردہ نہیں ہے۔ اس کے چہرے کی ساری دلکشی، رعنائی اور سادگی اس کی اپنی ہے اور جھوٹ اور تصنع سے پاک ہے۔ علی کو محسوس ہوا کہ اس نے ایسا چہرہ جس پر "سچ" کا گمان ہو، شاید پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

یکایک عورت نے نرم آواز میں کہا "آپ کو ٹیکسی اسٹینڈ نہیں معلوم تھا؟"

"نہیں۔" اس کی آواز مدھم تھی۔

"تعجب ہے۔ آپ تو یہیں رہتے ہیں۔"

علی سٹ پٹا گیا۔ یہ ایسا موضوع تھا جس پر وہ گفتگو نہ تو کرنا چاہتا تھا، نہ کر سکتا تھا۔ چند لمحے تذبذب کی حالت میں سوچتا رہا پھر دھیرے سے بولا "نہیں، میں یہاں نہیں رہتا، باہر سے آیا ہوں۔"

"اچھا، کہاں سے؟"

علی کو پھر الجھن ہوئی۔ کیا مصیبت ہے۔ آخر یہ محترمہ اسی ایک موضوع پر کیوں بات کر رہی ہیں۔ کوئی اور بات کیوں نہیں کرتیں۔ مثلاً یہ کہ آج سردی بہت زیادہ ہے۔ سبزی کا بھاؤ بڑھ گیا ہے۔ وہ جو سامنے ایک آدمی کھڑا ہے، اس کے سر پر ایک بھی بال نہیں ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنا نام ہی بتائیں۔ محترمہ کا نام غالباً آنسہ آمنہ بیگم، کنیز فاطمہ یا کچھ اس قسم کا ہوگا۔ علی نے دھیرے سے سانس لی اور اپنی آواز میں ذرا اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"میں جرمنی سے آیا ہوں۔ صرف چند دن پہلے، یہاں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"اچھا، آپ جرمنی سے آئے ہیں۔" عورت کے لہجے میں ایک خوش گوار حیرت کا تاثر تھا "کیا یہیں رہیں گے؟"

ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے دوسرا جھوٹ اور کبھی کبھی جھوٹ در جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے چنانچہ علی نے اطمینان سے کہا "یہاں میرا ایک دوست ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ میں یہیں رہوں مگر میں نے ابھی کچھ طے نہیں کیا ہے۔ شاید رہوں، شاید ہفتے دس دن میں واپس چلا جاؤں۔"

عورت تھوڑی دیر چپ رہی پھر کہنے لگی "یہ تو چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں تو شاید آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔"

"خیر ایسی تو کوئی بات نہیں۔" علی نے جواب دیا "میرے لیے چھوٹے بڑے شہر کی کوئی اہمیت نہیں۔ اصل بات ذریعۂ معاش ہے۔ اگر کوئی اچھی ملازمت مل گئی تو مجھے یہاں رہنے میں کوئی اعتراض نہیں۔"

"مجھے امید ہے آپ کو کوئی عمدہ ملازمت ضرور مل جائے گی۔" عورت نے خوش دلی سے کہا۔

علی مسکرایا، گردن موڑ کر ایک بار پھر اس کے چہرے کو دیکھا پھر نرم آواز میں بولا "آپ تو یقیناً یہیں رہتی ہیں، کس جگہ گھر ہے آپ کا؟"

"نہیں، میں یہاں نہیں رہتی۔" عورت کی آواز میں گہری افسردگی کا تاثر تھا "میں تو پریسٹن میں رہتی ہوں۔ یہاں میری بہن اور بہنوئی کا گھر ہے۔ بہنوئی ریلوے میں ملازم ہیں۔ میں اپنی بہن کے پاس آتی ہوں اور کبھی کبھی کئی دن رک جاتی ہوں۔ آج بہن کی طبیعت کچھ ناساز تھی، اس لیے میں تنہا ہی شاپنگ کرنے چلی آئی۔ بہنوئی کو مجھے لینے کے لیے آنا تھا، ان کے پاس کار ہے مگر شاید وہ کسی کام میں پھنس گئے۔"

"اچھا تو آپ پریسٹن میں رہتی ہیں۔" علی نے سر ہلایا "کہاں ہے یہ پریسٹن؟"

"یہاں سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ بلیک پول کے قریب، آپ نے بلیک پول کا نام تو سنا ہوگا؟"

"ہاں، سنا ہے مگر دیکھا نہیں۔"

"کبھی ضرور دیکھئے، بہت خوب صورت تفریحی مقام ہے۔ گرمیوں میں تو وہاں بہت رونق ہوتی ہے۔"

"جی، موقع ملا تو ضرور جاؤں گا۔"

علی کو یکایک اچنبھا ہوا۔ کتنی عجیب بات ہے وہ دونوں تو ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں اور وہ ایک مشرقی عورت ہے پھر بھی انہوں نے کتنی باتیں کر ڈالیں۔ باوصف اس کے کہ ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں۔ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ شاید دوسری بار ملاقات بھی نہ ہو پھر بھی گفتگو کر رہے ہیں جیسے گہری اور طویل واقفیت ہو۔ شاید یہ پردیس کی تنہائی کا فطری ردِ عمل ہے کہ کہیں کوئی اپنا چہرہ نظر آتا ہے تو عدم شناسائی اور تکلف کا پردہ خود بخود ہٹ جاتا ہے۔ اپنی زبان اور اپنا لہجہ سننے کے لیے کان بے تاب ہو جاتے ہیں اور لبوں پر پڑا ہوا خاموشی کا قفل کھل جاتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اس عورت نے ایک اجنبی مرد سے گفتگو کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی اور وہ خود بھی بلا ارادہ ایک کے بعد دوسری بات کہتا رہا۔ شاید اس ساری گفتگو کا اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ ماسوا اس کے کہ ان دونوں کے اندر چپ کے عذاب سے بچنے اور دل کا غبار نکالنے کی تڑپ موجود تھی۔ ہاں، یقیناً یہی بات ہے۔

علی نے ایک خوش گوار حیرت کے ساتھ سوچا اور دھیرے سے سانس لی۔

ٹیکسی اسٹینڈ آگیا۔ اتفاق سے ٹیکسی اسٹینڈ پر ایک ٹیکسی موجود تھی۔ علی نے سامان رکھنے میں عورت کی مدد کی۔ تھیلے ترتیب سے رکھے جاچکے تو عورت نے مسکرا کر علی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بے حد شائستہ لہجے میں ممنونیت سے کہا "آپ کا شکریہ' بہت مدد کی آپ نے۔"

"بھئی اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ یہ تو میرا فرض تھا۔" اس نے صدیوں پرانا اور فرسودہ جملہ دہرایا "آپ سے اتنی دیر گفتگو کی اچھا لگا۔ میرا نام آصف علی ہے۔ شاید پھر کبھی....." مگر وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ہی چپ ہوگیا۔

"میرا نام رقیہ بیگم ہے۔" عورت نے ذرا شرما کر کہا "شاید پھر کبھی ملاقات ہو۔" اس نے وہ جملہ مکمل کیا جو علی کہنا چاہتا تھا۔

"اچھا اب چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

علی وہیں کھڑا رہا۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی پھر چوراہے پر پہنچ کر بائیں جانب مڑ گئی۔ علی نے یکایک زور سے سانس لی اور قدم آگے بڑھایا۔

گھر پہنچا تو سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ دن کی شفٹ میں کام کرنے والے اپنے اپنے کام پر گئے ہوئے تھے۔ رات کی شفٹ والے سو رہے تھے۔ راجا بھی گھر میں نہیں تھا۔ چوہان کی مدد سے اسے گزشتہ دن ہی کام مل گیا تھا اور وہ ایک بجے اپنی ملازمت پر چلا گیا تھا۔ کسی ریستوران کے کچن میں کام کرنا تھا۔ فرش کی صفائی' برتن دھونا اور سبزی پیاز وغیرہ کاٹنا۔ کام محنت طلب تھا اور اوقاتِ کار بھی طویل تھے۔ دن میں ایک بجے سے لے کر رات کے دو بجے تک مگر بہرحال کام تھا' آمدنی کی ایک صورت۔ زمین پر پاؤں جمانے کے لیے ایک سہارا ان دونوں کو ہی درکار تھا۔ ویسے بھی وہ دونوں پسند' ناپسند اور انتخاب کے حق سے محروم تھے۔ فیصلہ حالات کو کرنا تھا اور انہیں اس فیصلے کو قبول کرنا تھا۔ چنانچہ راجا نے بھی پس و پیش نہیں کیا۔ یہ سوچ کر باورچی خانے میں برتن دھونا منظور کرلیا کہ ایک سہارا قائم ہوجائے۔ پاؤں زمین پر جم جائیں تو پھر کسی بہتر ملازمت کے لیے کوشش کرے گا۔

کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہرحال بہتر تھا۔

علی تھکے تھکے قدموں سے سیڑھیاں طے کرکے درمیانی منزل کے کچن میں پہنچا۔ چائے بنائی پھر چائے کا مگ لے کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ الیکٹرک ہیٹر آن کیا کیونکہ سردی کے باعث اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ جسم پر کپکپی طاری تھی۔ چہرے اور گردن کی کھال یوں یخ ہو رہی تھی جیسے جم گئی ہو۔ ہیٹر جلا کر وہ اس کے قریب قالین پر بیٹھ گیا اور ہولے ہولے چسکیاں لینے لگا۔ گرم گرم چائے حلق سے اتری اور ہیٹر کی آنچ بدن سے ٹکرائی تو اسے ایک انوکھی اور لذت آمیز راحت کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے زندگی دھیرے دھیرے اس کے نیم مردہ اور منجمد جسم میں واپس آرہی ہو۔ وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا اور اس کی خالی نظریں ہیٹر کی سرخ راڈ پر جمی رہیں۔ خالی اور بے مقصد' جیسے وہ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ دیکھ رہا ہو مگر اس کا ذہن خالی نہیں تھا۔ ذہن میں مختلف خیالات چکرا رہے تھے لیکن ان میں کوئی ربط نہیں تھا۔ بے تکے' بے ترتیب خیالات ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ایک مایوسی اور بے یقینی بھی اس کے دل و دماغ میں موجزن تھی۔ یہ مایوسی اور تذبذب کی کیفیت کیا تھی' اور کیوں تھی؟ وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ کیا ہے یہ؟ ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ کہیں کوئی بات غلط ہے۔ لیکن اگر غلط ہے یا کوئی ناخوش گوار بات ہونے والی ہے تو وہ کیا ہے؟ وہ سوچتا رہا پھر ذہن بھٹکتا ہوا اس عورت کی طرف چلا گیا جس کا سامان اس نے ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچایا تھا۔ کیا نام بتایا تھا' ہاں یاد آیا۔ رقیہ بیگم' کتنا روایتی نام ہے اور خالص مشرقی مگر بہت خوب صورت نام ہے۔ اسے ایسے ہی نام پسند ہیں۔ قدیم' روایتی اور مشرقی۔ رقیہ بیگم' اس نے زیرِلب اس نام کو دہرایا اور اسے بہت اچھا لگا پھر اس کے تصور میں رقیہ بیگم کا چہرہ ابھر آیا۔ ترشے ہوئے نقش و نگار' بڑی بڑی خوب صورت آنکھیں اور صبیح رنگت مگر علی کو یاد آیا کہ اسے رقیہ کے چہرے پر ایک افسردگی کی کیفیت نظر آئی تھی اور آنکھوں میں گہری اداسی اور گمشدگی جیسے وہ آنکھیں کہیں کھو گئی ہوں یا اجنبی چہروں کے ہجوم میں گم ہوگئی ہوں اور کسی کو پہچان نہ رہی ہوں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ وہ آنکھیں اتنی افسردہ اور مایوس کیوں تھیں۔ کیا دکھ تھا انہیں' کیا ملال تھا؟ یکایک علی کے اپنے دل میں پھیلی ہوئی مایوسی کچھ اور گہری ہوگئی۔ رقیہ کی شخصیت اسے اچھی لگی تھی۔ اس سے گفتگو کرنا اچھا لگا تھا مگر اس سے ہونے والی ملاقات تو سرِراہ اور اتفاقیہ تھی جیسے لوگ ریلوے اسٹیشن پر یا بس اسٹاپ پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں' دو چار رسمی باتیں کرتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں اور پھر دوبارہ کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔

کیا رقیہ سے اس کی پھر کبھی ملاقات ہوگی؟

دوسرے دن وہ صبح چھ بجے اٹھ بیٹھا۔ گھر میں خاموشی اور سناٹا تھا۔ رات کی شفٹ والے ابھی نہیں آئے تھے۔ دن کی شفٹ والے چھ بجے سے پہلے ہی کام پر جاچکے تھے۔ اس نے ایک نظر راجا پر ڈالی جو موٹے سے لحاف میں گھسا تقریباً گٹھڑی بنا ہوا بے خبر سو رہا تھا۔ پھر وہ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا کچن میں گیا۔ چائے بنائی' پھر باتھ روم کا رخ کیا۔ کپڑے بدل کر دوبارہ کچن میں آیا۔ رات کی بچی ہوئی سبزی اور ایک روٹی گرم کی اور نوالہ منہ میں رکھا۔

گھر سے نکلا تو سوا آٹھ بج رہے تھے مگر اجالا زیادہ نہیں تھا کیونکہ آسمان پر گہرے سیاہ بادل تہ در تہ محیط تھے۔ علی نے مفلر اچھی طرح گردن اور کانوں کے گرد لپیٹا اور سڑک کی جانب چلنا

شروع کیا۔
انگلستان میں اس کا ملازمت کا وہ پہلا دن تھا۔

○☆○

چوہدری کرم داد کا مکان اپنے آپ میں ایک چھوٹی سی دنیا تھی جس کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس دنیا کے اپنے اصول تھے' اپنے طور طریقے تھے۔ ایک چھوٹا سا سماج اس دنیا کی غیر مرئی دیواروں کے اندر خود بخود بن گیا تھا۔ اس سماج کے ممبروں کی اپنی دلچسپیاں تھیں اور اپنی مصروفیات۔ صبح سے شام کرنا اور جوئے شیر لانے کا اپنا انداز تھا۔ باہر کی دنیا میں جو کچھ رونما ہو' اس کی خبریں تو اس اندرونی دنیا میں آجاتی تھیں لیکن اندر جو کچھ ہو' اس کی کوئی خبر' کوئی اطلاع باہر نہیں جاتی تھی اور یہ ضروری بھی تھا۔ کیونکہ باہر کی دنیا کی مداخلت اس دنیا کے باسیوں کے لیے ضرر رساں ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سارے ہی مکینوں کے درمیان ایک خاموش اور غیر مشروط سمجھوتا آپ سے آپ ہو گیا تھا۔ نہ تم میرے بارے میں کچھ کہو' نہ میں تمہارے بارے میں زبان کھولوں گا۔ اس اصول پر ہر شخص خود بخود عمل کرتا تھا۔ صبح سے شام تک کی مصروفیات بھی لگی بندھی تھیں۔ صبح کے ساڑھے چار بجتے تو کمروں کی بتیاں جل جاتیں۔ دروازے کھلنے بند ہونے کی آواز گھر کی خاموش فضا میں گونجنے لگتی۔ برتن کھڑکتے اور باتوں کی مدھم آوازیں سنائی دیتیں۔ صبح کی شفٹ میں کام کرنے والے ساڑھے پانچ بجے تک تیار ہو کر چلے جاتے پھر ایک گھنٹے تک سناٹا رہتا لیکن جونہی ساڑھے چھ بجتے' ایک بار پھر دروازوں کی چرچراہٹ شروع ہو جاتی۔ کبھی بشیر احمد کی آواز سنائی دیتی تو کبھی منظور احمد بیدل کے گنگنانے کی آواز سنائی دیتی۔ ساڑھے سات بجے ان لوگوں کی واپسی کا وقت ہوتا' جو رات کی شفٹ میں ہوتے۔ آدھے گھنٹے تک وہ لوگ مصروف رہتے پھر وہ اپنے بستروں میں گھس جاتے اور پورا مکان ایک بار پھر گہرے سکوت میں ڈوب جاتا۔

دن میں عموماً سناٹا رہتا لیکن شام ہوتی تو کچھ چہل پہل شروع ہو جاتی۔ جو افراد گھر میں ہوتے' وہ مختلف کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ سبزی گوشت کی خریداری' کھانا پکانا' کپڑے وغیرہ دھونا یا استری کرنا۔ چار بجے سے رات کے دس گیارہ بجے تک خاصی رونق رہتی۔ بات چیت کی آوازیں سنائی دیتیں۔ منظور احمد بیدل اور رحمت علی کی بحث شروع ہوتی تو سارے مکان میں ان کی آواز گونجتی۔ ان دونوں کو سیاسی اور تاریخی موضوعات پر بحث کرنے کا مراق تھا۔ کبھی کبھی قربان بھی ان کی بحث میں شامل ہو جاتا تو جنگ و جدل کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ یوں لگتا کہ بس اب ہاتھا پائی اور مارپیٹ تک نوبت پہنچ جائے گی مگر ہوتا کچھ بھی نہیں۔ بحث کے اختتام پر قربان سگریٹ کی ڈبیا برآمد کرتا اور ایک ایک سگریٹ دونوں کی طرف بڑھا کر کہتا۔

"اچھا یار گولی مارو۔ کلنٹن اور ٹونی بلیئر دونوں کی ایسی کی تیسی' لو سگریٹ پیو۔"

"ہاں یار' اگر دونوں ایک دوسرے کے بستر میں سوتے ہیں تو ہمیں کیا۔" منظور احمد بیدل کش لے کر کہتا "تم میری تازہ غزل سنو' کل رات ہی کی ہے۔"

"غزل ضرور سناؤ مگر سالن کا دھیان رکھنا' کہیں جل نہ جائے۔" رحمت علی فقرہ چست کرتا۔

منظور احمد بیدل میٹرک فیل تھا مگر شاعری بھی کرتا تھا اور افسانہ نگاری بھی۔ پڑھنے والوں کی بدقسمتی کہ اس کے دو تین ٹوٹے پھوٹے افسانے تیسرے درجے کے رسالوں میں چھپ بھی گئے تھے۔ ان افسانوں کی اشاعت نے منظور بیدل کو دانش وری کے خبط میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بڑا ذہین' باکمال اور صاحب طرز افسانہ نگار اور شاعر ہے۔ اس کا اسلوب منفرد ہے اور اس کے افکار میں روحِ عصر موجود ہے مگر اسے وہ پذیرائی نہیں مل رہی جس کا وہ بجا طور پر مستحق ہے کیونکہ وہ کسی گروہ سے وابستہ نہیں اور نہ ہی کسی "ستائشِ باہمی" کلب کا ممبر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے گروہ بند ادیب' نقاد اور پبلشر اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ نہ صرف نظر انداز ہی کرتے ہیں بلکہ اس کی راہ میں بندشیں بھی قائم کرتے ہیں کیونکہ وہ نہیں چاہتے ہیں کہ منظور احمد بیدل آگے بڑھے اور آسمانِ ادب کا... روشن سورج بن جائے مگر منظور احمد بیدل مایوس نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن آئے گا جب وہ ایک ایسا ناول لکھنے میں کامیاب ہو جائے گا جو لیو ٹالسٹائی کے ناول "وار اینڈ پیس" سے کسی صورت کم نہیں ہو گا اور جب وہ ناول چھپے گا تب اردو دنیا کو اس کی عظمت کا علم ہو گا۔

ایک بار بشیر احمد نے اس سے سوال کیا "تم نے "وار اینڈ پیس" پڑھا ہے؟"

منظور احمد بیدل نے بغلیں جھانکیں' پہلو بدلا پھر مدھم آواز میں بولا "نہیں۔"

منظور احمد بیدل کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ اگر اس کے افسانوں اور غزلوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ اچھا نیک اور ذمے دار آدمی ہے۔ اس کی عمر کوئی تیس سال تھی۔ گزشتہ کئی سال سے وہ برطانیہ میں تھا۔ بارہ گھنٹے روزانہ کام کرتا تھا اور ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے اپنی ماں کو ایک بڑی رقم بھیجتا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی' اور سردست اس کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس کی چار بہنیں تھیں' ایک چھوٹا بھائی تھا' باپ کا انتقال ہو چکا تھا' صرف بوڑھی ماں تھی۔ منظور احمد بیدل کو اپنی بہنوں اور بھائی سے بڑی محبت تھی۔ ان کی خوشیوں اور بہتر مستقبل کے لیے وہ شادی سے احتراز کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب تک میں اپنی بہنوں کو ان کے گھر میں آباد نہ کر دوں' تب تک میں شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں ہی ان کا سہارا ہوں' ان کی آئندہ زندگی کو سنوارنا میری اوّلین ذمے داری ہے۔ جب وہ اپنی بہنوں کا ذکر کرتا

تو بڑا جذباتی ہو جاتا' یوں لگتا جیسے وہ ان کا بڑا بھائی نہ ہو' باپ ہو۔ اس کی اسی خوبی کی بنا پر اس کی تمام ترلن ترانی' لفاظی اور مادر پدر آزاد شاعری کے باوجود' سب ہی لوگ اسے اچھی نظر سے دیکھتے تھے۔ منظور احمد بیدل واقعی بڑا باکمال آدمی تھا۔ اتنی بڑی ذمے داری اس نے اپنے سر لے رکھی تھی لیکن اس ذمے داری کا کوئی منفی اثر اس کے مزاج پر نہیں پڑا تھا۔ ہر وقت خوش رہتا' ہنستا بولتا' دوسروں کے کام آتا۔ تھکنا تو شاید اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ صبح سے رات گئے تک مصروف رہتا تھا لیکن اضمحلال اور بیزاری اس کے پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ سلیمان اس کا روم میٹ تھا مگر اتفاق سے وہ نہ صرف قدرے کاہل تھا بلکہ کھانا پکانا بھی بالکل نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ کھانا پکانے کی ذمے داری مستقل طور پر منظور احمد بیدل نے اپنے سر لے لی تھی۔ وہ ساتوں دن کھانا بھی پکاتا' ناشتا بھی اور سودا سلف کی خریداری بھی کرتا لیکن اس کے ماتھے پر شکن نہ پڑتی۔ منظور احمد بیدل کے خلوص اور عنایات کے عوض سلیمان یہ کرتا کہ اس کی غزلیں' نظمیں اور افسانے سنتا اور دل کھول کر داد دیتا حالانکہ اس کی تعلیم واجبی سی تھی۔ اسے ردیف' قافیے اور زمین اور بحر سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا پھر بھی داد یوں دیتا تھا جیسے منظور احمد بیدل کے کلام بلاغت نظام کے تمام رموز و نکات اس کی سمجھ میں پوری طرح آگئے ہوں۔

ویسے بھی سلیمان کا وقت گھر میں کم ہی گزرتا تھا۔ وہ ایک ہوشیار اور موقع محل دیکھ کر عمل کرنے والا آدمی تھا۔ اس کی کاہلی اور منظور احمد بیدل کی شاعری کی تعریف و تحسین کے پیچھے بھی یہی چالاکی کارفرما تھی۔ اس طرح وہ خود کام کرنے سے بچ جاتا اور زیادہ وقت اپنی منظورِ نظر سے ملنے کی کوشش میں گزارتا۔ اس کی منظور نظر کا نام تو کسی کو نہیں معلوم تھا مگر سلیمان ہمیشہ اس کا ذکر دل آرام کہہ کر کرتا تھا چنانچہ مکان کے باسیوں میں اس کا نام ہی دل آرام پڑ گیا تھا۔ سلیمان نے کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔ شاہ نواز نے ایک بار اسے مارکیٹ میں سلیمان کے ساتھ چند منٹ کے لیے دیکھا تھا۔ اس سے زیادہ اسے بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس راز داری کا سبب یہ تھا کہ سلیمان نے اپنی دل آرام اور اس کے گھر والوں کو اس بات کی اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ طلاق یافتہ ہے اور یہ کہ اس کے ویزے میں صرف تین ماہ کی مدت باقی رہ گئی ہے۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے شادی ہو جائے' پھر ویزے کے بارے میں اطلاع دے گا تاکہ پھر برطانیہ میں اس کے مستقل قیام کے لیے اس کی بیوی کی طرف سے درخواست دی جائے۔ سلیمان چونکہ خود ایک چالاک اور موقع شناس آدمی تھا اس لیے وہ کسی پر بھی بھروسا نہیں کرتا تھا اور اسی بنا پر اس نے گھر کے مکینوں اور اپنے واقف کاروں کو اپنی دل آرام سے بے خبر رکھا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اس کا راز فاش کر دے اور اس کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر جائے۔

سلیمان کے علاوہ اور کوئی ایسا اس گھر میں نہیں تھا جس کے پاس مٹر گشتی کے لیے وقت ہوتا۔ جنھیں قانون کا ڈر نہیں تھا' وہ بھی کام سے آنے کے بعد کا سارا وقت گھر میں ہی گزارتے۔ بشیر احمد اور صدیق زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتے۔ باقی افراد کھانا پکانے' کپڑے دھونے' ٹی وی دیکھنے اور گپیں ہانکنے میں مصروف رہتے۔ علی' راجا اور شاہ نواز قانون کی نظروں سے بچنے پر مجبور تھے لہٰذا وہ گردن جھکا کر سنسان راستوں سے ہوتے ہوئے اپنے اپنے کام پر جاتے اور جب واپس آتے تو باہر جانے کا نام بھی نہ لیتے۔ قربان کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح غالباً کسی ایجنٹ کے ذریعے رشوت دے دلا کر تین ماہ کا وزیٹنگ ویزا حاصل کیا تھا۔ پتا ایڈنبرا میں آباد کسی واقف کار کا دیا تھا لیکن جب برطانیہ پہنچا تو ایڈنبرا میں صرف دو ہفتے رہا' وہ بھی اس شخص کے پاس نہیں جس کا پتا دیا تھا کیونکہ وہ آدمی ایڈنبرا میں موجود ہی نہیں تھا۔ چند ہفتے قبل اسکاٹ لینڈ چھوڑ کر امریکا چلا گیا تھا۔ قربان نے دو ہفتے ایڈنبرا میں گزارے پھر وہاں سے روانہ ہوا' پہلے کارلائل میں ٹھہرا پھر والسال ہوتا ہوا کارڈف چلا گیا۔ یہ تمام وقت اس نے کیوں کر گزارا تھا کس کے پاس ٹھہرا تھا؟ اخراجات کیسے پورے کیے تھے' یہ تمام تفصیل وہ کبھی کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ جب اس کے ویزے کی میعاد ختم ہونے میں صرف دس بارہ دن باقی رہ گئے تھے تو ایک دن اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور کئی بسیں بدلتا ہوا راچڈیل پہنچا۔ صدیق سے غالباً اس کی تھوڑی بہت پرانی واقفیت تھی اور اس کے پاس صدیق کا پتا بھی تھا چنانچہ وہ سیدھا چوہدری کرم داد کے مکان پر پہنچا اور چوہدری کرم داد نے حسبِ عادت "اپنوں کی مدد" کے جذبے کے تحت اسے رہائش کے لیے جگہ دے دی۔

جب یہ ساری تفصیل علی کو معلوم ہوئی تو ایک شام کو اس نے قربان کو پکڑ لیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ کچھ سردی کو بُرا بھلا کہا اور شمال سے آنے والی برفیلی ہوا کو کوسا پھر سگریٹ جلا کر بولا "یار قربان بھائی پولیس تو تمہاری تلاش میں ہوگی؟"

"یقیناً ہوگی۔" قربان نے بے پروائی سے کہا۔

"کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں یہاں آئے ہوئے؟"

"تقریباً آٹھ ماہ۔"

"گویا گزشتہ پانچ ماہ سے تم چھپے ہوئے ہو" علی نے سوچتے ہوئے کہا "لیکن اگر پولیس تمہیں تلاش کرنے اور پکڑنے میں کامیاب ہو گئی تو کیا ہوگا؟"

قربان بے فکری سے ہنسا "ارے یار علی' ہوگا کیا۔ وہ مجھے حوالات میں ڈال دیں گے۔ پھر مقدمہ چلے گا جس میں' میں یقینی طور پر رہا ہو جاؤں گا پھر وہ مجھے جہاز میں بٹھا دیں گے۔ قصّہ ختم۔"

علی کو قربان کی بے فکری اور بے پروائی پر تعجب ہوا۔ اس نے گرفتاری' مقدمے اور جبری واپسی کا ذکر یوں کیا جیسے کہہ رہا ہو' دال

میں نمک تھوڑا کم ہے۔ علی چند لمحے حیرت سے اسے دیکھتا رہا پھر تعجب سے بولا "تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر تو لگتا ہے۔" قربان نے خود بھی ایک سگریٹ سلگائی "لیکن جو قدم میں نے اٹھایا ہے' وہ غیر قانونی ہے اور اس میں خطرہ ہے۔ اب اگر آدمی ڈرنے لگے تو ایسا قدم کیوں اٹھائے۔ میں بھی ڈرتا ہوں مگر پروا نہیں کرتا۔ جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ اگر وہ مجھے پکڑنے میں کامیاب ہوگئے تو ٹھیک ہے' واپس چلا جاؤں گا۔ یہاں تو روزانہ ہی نہ جانے کتنے غیر قانونی تارکینِ وطن پکڑے جاتے ہیں۔ صرف ہمارے ملک سے آنے والے ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں سے آنے والے بھی۔ البانیہ' رومانیہ' پولینڈ' ترکی' کردستان' عراق اور نہ جانے کن کن ممالک سے لوگ آتے ہیں۔ آج کل سری لنکا سے آنے والوں کا زور ہے۔ وہ لوگ پکڑے جاتے ہیں اور واپس بھیجے جاتے ہیں۔ اگر میں بھی دھر لیا گیا تو دیکھا جائے گا۔"

"یار اتنے ملکوں سے لوگ یہاں آتے ہیں؟"

"ہاں یار۔" قربان ہنس پڑا "ہے تو تعجب کی بات مگر سچ ہے۔"

علی تھوڑی دیر چپ رہا اور ذرا اضطراری نظروں سے قربان کو دیکھتا رہا۔ دراصل یہ ساری گفتگو اس نے ایک خاص مقصد کے تحت شروع کی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ غیر قانونی طور پر آنے والے برطانیہ میں اپنے قیام کو طول دینے یا قانونی طور پر رہائش اختیار کرنے کا حق حاصل کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ وہ خود غیر قانونی طور پر آیا تھا اور ایک غیر یقینی حالت میں' غیر محفوظ وقت گزار رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ہمیشہ پولیس اور قانون کی نظروں سے چھپ کر نہیں رہ سکتا۔ تو پھر وہ کیا کرے گا' کب تک چھپے گا اور چھپے رہنے میں کامیاب بھی ہوگا یا نہیں۔ اگر وہ اپنے قیام کو جائز اور قانونی بنانا چاہے تو اس کے لیے کیا اقدامات کرنا ہوں گے۔ یہ الجھن اور تجسس مسلسل علی کے ذہن میں موجود تھا اور اسی بنا پر وہ لوگوں سے اس موضوع پر گفتگو کرتا تھا تاکہ زیادہ معلومات حاصل کرسکے۔

کچھ دیر کے سکوت کے بعد آخر کار علی نے لب کھولے "یار قربان بھائی' تم تو جانتے ہو' ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اسی لیے میں تم سے یہ باتیں پوچھ رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں مجھے بھی کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے تو میں کیا کروں گا۔ ممکن ہے تمہاری رہنمائی اور مشوروں سے مجھے بھی کچھ فائدہ پہنچے۔ چنانچہ یہ بتاؤ کہ اگر تم دیر تک یہاں رہنا چاہو تو کیا کرو گے۔ نیز یہ کہ بالفرض انہوں نے تمہیں تلاش کرہی لیا تو اس صورت میں تم کیا کرو گے۔ کوئی نہ کوئی طریقہ تو تمہارے ذہن میں ہوگا؟"

قربان ہنسا "یار یہ تو چوہے بلی کا کھیل ہے۔ بلی چوہے کی جستجو میں ہے' چوہا چھپتا پھر رہا ہے۔ جب تک چوہا جان بچا سکے گا' بچائے گا۔ جب پکڑا جائے گا تو پھر جو کچھ بھی اس کے نصیب میں ہو۔" وہ رک کر چند ثانیے سوچتا رہا پھر سر ہلا کر بولا "میں کیا کروں گا؟ سرِدست کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پہلی کوشش تو میری یہ ہے کہ ایک نیا پاسپورٹ بن جائے۔ جس میں میرے موجودہ پاسپورٹ کا کوئی حوالہ نہ ہو۔ میں کوشش کررہا ہوں۔ سفارت خانے کے ایک آدمی سے رابطہ ہوا ہے۔ کامیابی کی خاصی امید ہے۔ اگر نیا پاسپورٹ بنا تو اس بنیاد پر بنے گا کہ میرا پچھلا پاسپورٹ گم ہوگیا ہے یا پھر کوئی اور بہانہ کیا جائے گا۔ بہرحال ابھی طے نہیں ہوا ہے۔ اگر پاسپورٹ مل گیا تو میں اس پاسپورٹ پر چند دن کے لیے یورپ کے کسی ملک میں جاؤں گا۔ یوں ائرپورٹ کی مہر لگ جائے گی۔ اس کے بعد پھر کچھ زیادہ خطرہ نہیں رہے گا۔"

علی شدید حیرت زدہ نظر آرہا تھا "کیا ایسا ممکن ہے؟"

"یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" قربان نے ایک اور سگریٹ جلائی "میں نے سنا ہے کہ بعض لوگوں نے اس طرح پاسپورٹ بنوائے ہیں اور اسی بنیاد پر میں نے بھی کوشش کی ہے۔ شاید کامیابی ہوجائے۔"

علی کچھ دیر گومگو کی حالت میں بیٹھا رہا پھر بولا "اس میں پیسہ کتنا خرچ ہوگا؟"

قربان نے رقم بتائی تو علی سٹ پٹا گیا "کیا واقعی..... مگر یار یہ تو کافی بڑی رقم ہے۔"

"ہاں' رقم تو بڑی ہے مگر کام کی نوعیت کو دیکھو تو کچھ زیادہ نہیں۔ ویسے بھی بھائی' غرض اور مجبوری تو میری ہے۔ اگر بلی کے پنجوں سے بچنا ہے تو یہ رقم تو خرچ کرنا ہی پڑے گی۔"

علی نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور دل ہی دل میں حساب لگایا تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اگر وہ بھی یہی راستہ اختیار کرے تو اسے دو تین سال شدید محنت کرنا ہوگی۔ پائی پائی بچانا پڑے گی' تب شاید وہ اس قابل ہوسکے کہ مذکورہ رقم ادا کرسکے لیکن کیا وہ ایسا کرسکتا ہے؟ اپنی جان تو خیر وہ مار سکتا ہے اور اپنی ضرورتیں بھی۔ تھوڑے پیسوں میں گزارہ کرنے کی اہلیت اور ہمت اس میں ہے لیکن کیا وہ اپنی ماں اور بہنوں کو محرومی کے عذاب سے دوچار کرسکتا ہے؟ اپنے بھائی کی تعلیم کو خطرے میں ڈال سکتا ہے؟ اس نے زور سے سانس لی جو اس کے دل میں ابھرنے والی مایوسی کی غماز تھی پھر اس نے قربان کی طرف دیکھا۔

"تم نے ابھی کہا تھا کہ یہ پہلی کوشش ہوگی۔ کیا کوئی دوسرا طریقہ بھی ہے؟"

قربان مسکرایا "ہاں' فرض کرو اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوتی ہے۔ فرض کرو' وہ مجھے پکڑ لیتے ہیں تو اس صورت میں' میں فوراً اسائلم یعنی سیاسی پناہ کی درخواست دے دوں گا۔"

"سیاسی پناہ؟"

"ہاں' میں کہوں گا کہ اپنے ملک میں مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے کیونکہ میں ایک سیاسی کارکن ہوں اور حکومتِ وقت کی نظروں

میں معتوب ہوں۔ واپس جاؤں گا تو یا تو اپنی جان سے جاؤں گا اور یا پھر مجھے بے بنیاد اور فرضی مقدموں میں پھانس کر طویل عرصے کے لیے جیل بھیج دیا جائے گا۔"

علی کی معلومات اس موضوع پر ذرا محدود تھیں۔ اس نے حیرت سے کہا "اس کا فائدہ کیا ہوگا؟"

قربان نے کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا پھر کہنے لگا "کچھ خاص نہیں، بس اتنا ہوگا کہ حکومت ضروری تفتیش کرے گی۔ مقدمے کی دو تین پیشیاں پڑیں گی۔ اس میں دو ڈھائی سال کا عرصہ نکل جائے گا۔ اس عرصے میں مجھے کچھ رقم جمع کرنے کا موقع مل جائے گا پھر مقدمے کا فیصلہ ہوگا جو ظاہر ہے کہ میرے خلاف ہوگا پھر امیگریشن والے مجھے جہاز پر بٹھا دیں گے۔ عموماً یہی ہوتا ہے۔ سیاسی پناہ کے کیسوں میں مشکل سے دو چار ہی ایسے ہوتے ہیں جن میں کامیابی ہوتی ہے اور طویل قیام کی اجازت مل جاتی ہے ورنہ ہر مقدمے کا فیصلہ درخواست گزار کے خلاف ہوتا ہے اور اسے واپس جانا پڑتا ہے۔"

علی بدستور حیرت زدہ نظر آرہا تھا "اچھا تو اسائلم کی درخواست اس لیے دی جاتی ہے! مگر یار، یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔"

"اچھی بات تو نہیں ہے۔" قربان نے گہری سانس لی اور تلخ نظروں سے علی کو دیکھا "مگر کون سی بات اچھی ہے۔ تم کتنی باتوں پر نکتہ چینی کرو گے۔ ہمارے ملکوں میں تو شاید کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔ وہاں تو یہ حال ہے کہ عبادت گاہوں کا تقدس تک پامال کیا جاتا ہے۔ ان کا نام ونشان مٹایا جاتا ہے۔ پھر رشوت، مہنگائی، چور بازاری، تعصب اور نفرت، ارے یار کس کس بات کا ماتم کرو گے تم۔ اور یہ اسی بے سروسامانی اور افراتفری کا نتیجہ ہے کہ لوگ یورپ کی طرف دیکھتے ہیں اور یہاں آنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ یہ یقیناً برا ہے لیکن تم کسے کسے الزام دو گے اور کیوں؟ تم خود بھی تو غیر قانونی طور پر آئے ہو۔ کیا تم نے کوئی اچھا کام کیا ہے؟"

علی شرمندہ ہو کر مسکرانے لگا۔

گراؤنڈ فلور پر ایک باورچی خانہ تھا اور ایک سٹنگ روم۔ مکینوں کو کھانا پکانے کے وقت سٹنگ روم میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کچن میں ہجوم ہو جاتا اور بیٹھنے کے کمرے میں بیٹھنے کی جگہ کم پڑ جاتی۔ اس مشکل کا حل چوہدری کرم داد نے یوں نکالا تھا کہ پہلی منزل پر باتھ روم سے ملحق اسٹور روم کو کچن میں تبدیل کر دیا تھا لیکن سٹنگ روم کا مسئلہ بدستور موجود تھا۔ علی اور راجا کے وہاں پہنچنے کے کچھ دن بعد کی بات ہے کہ منظور احمد بیدل نے اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔ پہلی منزل پر کمروں کے درمیان کی لینڈنگ ... کی جگہ قدرے کشادہ تھی۔ منظور احمد بیدل نے چوہدری کرم داد سے کہہ کر قالین کا ایک ٹکڑا حاصل کیا اور اسے لینڈنگ پر بچھا دیا۔ تین چار کرسیاں بھی کسی کباڑی کی دکان سے لے آیا پھر چوہدری کرم داد سے ٹیلی وژن کا مطالبہ کیا۔ چوہدری کرم داد نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرا، ناک بھوں چڑھائی اور معاندانہ نظروں سے منظور احمد بیدل کو گھورا پھر تیس پاؤنڈ نکال کر دیے دیے۔ منظور احمد بیدل نے چندہ کر کے باقی رقم پوری کی اور پچاس پاؤنڈ میں ایک اچھی کنڈیشن کا پرانا ٹی وی خرید لایا اور لینڈنگ پر، تیسری منزل پر جانے والی سیڑھیوں کے نیچے رکھ دیا۔ یوں ایک باقاعدہ سٹنگ روم بن گیا پھر گھر کے مکین خود بخود دو حصوں میں بٹ گئے۔ چوہدری کرم داد، بشیر احمد، صدیق، رحمت علی اور سلیم خاں گراؤنڈ فلور کا باورچی خانہ اور بیٹھک استعمال کرتے تھے جب کہ پہلی منزل کا کچن اور لینڈنگ کا "سٹنگ روم" باقی چھ افراد کے زیر استعمال تھا۔ شام کا وقت جب کہ کئی افراد گھر میں ہوتے، خاصا پُررونق ہوتا تھا۔ دن بھر گھر کے در و دیوار سے لپٹی ہوئی خاموشی اور اداسی کھڑکیوں سے نکل کر کہیں چلی جاتی اور گھر چھوٹی چھوٹی باتوں، قہقہوں اور چلتے پھرتے قدموں کی آواز سے بھر جاتا۔ ایسا لگتا جیسے زندگی باہر کے ویرانوں میں بھٹکنے کے بعد چپکے سے گھر میں واپس آگئی ہے اور روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہے۔ کچن میں کھانا پکتا رہتا۔ وہ لوگ قالین یا کرسیوں پر بیٹھے دنیا جہان کی ضروری، غیر ضروری اور اہم اور غیر اہم باتیں کرتے رہتے۔ چھٹی کا دن تو محض رات گئے تک چلتا۔ منظور احمد بیدل اپنا تازہ کلام سناتا اور سامعین زیادہ تر دوستی اور رواداری کے جذبے کے تحت دل کھول کر داد دیتے۔ کبھی کبھی تاش کی محفل جم جاتی۔ عام طور پر کوٹ پیس کھیلا جاتا لیکن کبھی کبھی فلش یا رمی بھی کھیلی جاتی۔ تاہم یہ خیال رکھا جاتا کہ ہار جیت پانچ سات پاؤنڈ سے زیادہ نہ ہو۔ بشیر احمد اور صدیق ان محفلوں میں حصہ نہیں لیتے تھے کیونکہ تاش کے کھیل اور جوئے دونوں ہی سے انہیں نفرت تھی۔ علی بھی فلش یا رمی میں شرکت سے احتراز کرتا تھا کیونکہ اس کی جیب میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ پچاس پنس بھی ہار سکے۔ وہاں کبھی شطرنج کی بازی جمتی تو بشیر احمد بھی اگر موجود ہوتے تو اپنے کمرے سے نکل کر آجاتے۔ صدیق بھی سیڑھیاں چڑھنے کی زحمت کرتے اور شطرنج کے کھیل میں شریک ہو جاتے۔ ان دونوں کو شطرنج سے نہ صرف دلچسپی ہی تھی بلکہ وہ خاصی مہارت بھی رکھتے تھے لیکن شام کی اس ہماہمی اور رونق سے راجا محروم ہی رہتا تھا کیونکہ وہ ساتوں دن کام کرتا تھا۔ دن میں ایک دو بجے جاتا تو رات میں دو بجے واپس آتا۔ علی نے روز مرہ ضروریات کی ذمے داری خود سنبھال لی تھی۔ کچھ اس بنا پر کہ اس کے پاس شام کا وقت تھا اور کچھ اس لیے کیونکہ راجا نے اس کی مدد کی تھی۔ اس وقت اسے سہارا دیا تھا جب وہ خود کو برطانیہ کی اجنبی، نامانوس اور نامہربان فضا میں بالکل ہی بے سہارا محسوس کر رہا تھا۔ وہ کھانا پکاتا، برتن دھوتا حتیٰ کہ کمرے کی صفائی بھی خود ہی کرتا۔ گلی کے باہر سڑک پر ایک انڈین گجراتی کی گروسری شاپ تھی جہاں ضروریات کی تمام اشیا مل جاتی تھیں۔

علی اس دکان سے ضرورت کی ساری چیزیں خرید لاتا۔ سبزی' بریڈ' انڈے اور کبھی کبھی گوشت۔ کبھی کبھی اس بنا پر کیونکہ وہ ہر روز مہنگی سبزیوں' انڈوں اور گوشت کی عیاشی نہیں کرسکتے تھے۔ زیادہ سستی سبزیوں پر گزارہ کرتے اور یا پھر ڈبے کی سبزیوں بیسز اور چنے کے سالن کو ترجیح دیتے۔

علی کے اوقاتِ کار اور معمولات بھی لگے بندھے تھے۔ وہ صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب اٹھتا۔ اس وقت گھر کے دو ایک کمروں کی بتیاں جل رہی ہوتیں۔ برتنوں کے کھڑکنے کی مدھم آوازیں بھی سنائی دے جاتیں۔ وہ بے آواز قدموں سے سیڑھیاں طے کرکے پہلی منزل پر آتا' جہاں کچن اور باتھ روم تھا۔ کچن عموماً خاصا گرم ہوتا کیونکہ صبح کی شفٹ والے دو تین افراد اس سے پہلے اٹھتے تھے اور ناشتا پانی سے فارغ ہوکر کام پر جاچکے ہوتے تھے۔ علی باتھ روم جاتا پھر ناشتا کرتا جو عموماً رات کی بچی ہوئی روٹی اور سبزی وغیرہ پر مشتمل ہوتا۔ ساتھ ہی راجا کے ناشتے کا بندوبست بھی کردیتا پھر اپنے کمرے میں آکر چپکے چپکے کپڑے بدلتا تاکہ راجا کی نیند نہ ٹوٹے پھر گھر سے باہر نکلتا تو سوا سات بج رہے ہوتے۔ پہلے دیپک نے اس کے کام کے اوقات نو بجے سے آٹھ بجے تک مقرر کئے تھے مگر دو دن بعد وقت بدل کر آٹھ سے سات بجے تک کردیا تھا۔ علی آٹھ بجے سے چند منٹ پہلے ہی فیکٹری پہنچ جاتا اور کام میں مصروف ہوجاتا۔ اس کے لیے کوئی خاص کام مقرر نہیں تھا۔ صبح سے شام تک اسے مختلف کام کرنے پڑتے۔ کبھی تیار شدہ کپڑوں پر استری کرتا' کبھی ٹرک سے مال اتارتا یا لوڈ کرتا۔ فرش اور کیفٹین کی صفائی کی ذمے داری بھی اس کے ذمے تھی۔ جب وہ برش سنبھال کر فرش کی صفائی شروع کرتا تو کبھی کبھی اس کا دل بھر آتا۔ ایک بے نام سی اداسی اور بے مائیگی کا احساس اسے پژمردہ کردیتا۔ یوں لگتا جیسے وہ چوری کررہا ہے۔ اپنے خوابوں سے اپنے ارادوں سے اور خود اپنے آپ سے چوری کررہا ہے۔ اپنے دل کی جمع پونجی' جو چند خواہشوں اور چند خوابوں پر مشتمل ہے' خود ہی چرا رہا ہے۔ تو گویا وہ کچھ بھی نہیں' محض ایک چور ہے اور اپنے دل کی عدالت میں کھڑا ہے جہاں وہ خود ہی جج ہے' خود ہی گواہ اور خود ہی وکیل استغاثہ لیکن وکیل صفائی کوئی نہیں ہے۔ اس کے اوپر فردِ جرم عائد کی گئی ہے۔ حضورِ والا یہ آدمی چور ہی نہیں ریاکار اور غدار بھی ہے۔ اس نے چوری بھی کی ہے اور غداری بھی۔ اس نے خود اپنے خواب چرائے اور انہیں مار ڈالا۔ پھر اس نے اپنی اماں کی امیدوں اور خوابوں سے غداری کی۔ انہیں دھوکا دیا۔ اس مردود و منافق شخص نے جتنے وعدے ان سے کئے تھے ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا۔ وہ خواب جو اس کی اماں نے دیکھے تھے' ریشم کے پھولوں کی طرح نرم اور خوش رنگ اور پاکیزہ تھے مگر اس نے انہیں پیروں تلے روند ڈالا۔ اور حضور والا' یہ برش جو آپ اس کے ہاتھوں میں دیکھ رہے ہیں اس نے اسی برش سے ان پھولوں کو' ان کی بکھری ہوئی زخمی پتیوں کو جھاڑ کر' بٹور کر کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا ہے۔ حضور والا یہ جرم سنگین ہے اور یہ شخص سخت سے سخت سزا کا مستوجب ہے لہٰذا حضور والا سے مؤدبانہ مگر پُرزور گزارش ہے کہ اسے سخت ترین سزا دی جائے۔ پھر بحیثیت جج وہ خود اپنے خلاف فیصلہ سناتا ہے۔ اس شخص کو چوراہے پر پھانسی کی سزا دو اور اس کی لاش کو چوراہے پر ہی لٹکا رہنے دو تاکہ لوگ دیکھیں اور عبرت حاصل کریں اور پھر کبھی کسی کو خود اپنے خواب قتل کرنے اور خود اپنے آپ سے' اپنا آپ چرانے کی جرأت نہ ہو۔

تو وہ چور ہے' خود اپنا چور۔ وہ زور زور سے برش کو فرش پر رگڑتا اور اس کے دل میں ابھرنے والی ہزیمت اور احساسِ جرم اور افسردگی بڑھتی چلی جاتی۔ تھکن کا احساس طاری ہوتا اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کا جسم تھک تھک کر چور ہوگیا ہے۔ ٹانگیں بے جان سی ہونے لگتیں مگر وہ برش چلاتا رہتا۔ اردگرد سے بے خبر' اپنے آپ سے غافل۔ یہ بھی احساس نہ رہتا کہ کھانے یا چائے کا وقفہ ہوچکا ہے پھر عبدل اس کے پاس آتا اور اس کا شانہ تھپتھپاتا۔

"ارے یار علی' کیا بات ہے۔ کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

وہ عبدل کو جو مشین پر کام کرتا تھا' یوں دیکھتا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔

فیکٹری میں ماسوائے دو تین افراد کے کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ غیر قانونی طور پر برطانیہ میں داخل ہوا ہے۔ جن دو تین افراد کو علم تھا' ان میں عبدل بھی شامل تھا اور یہ ذمے داری دیپک پٹیل نے عبدل کو سونپی تھی کہ وہ محتاط رہے اور نظر رکھے۔ علی کے علاوہ تین افراد فیکٹری میں اور بھی تھے جو قانونی طور پر کام کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ ان میں ایک ہندو تھا جو تفریحی ویزے پر آیا تھا اور چوری چھپے کام کرکے چار پیسے بنانے میں مصروف تھا جبکہ دوسرے دو افراد تھے تو برطانیہ ہی کے شہری' لیکن "بیکار" تھے۔ سوشل سیکیورٹی میں سائن کرتے تھے اور ہر ہفتے معقول "بیکاری الاؤنس" وصول کرتے تھے۔ ساتھ ہی دیپک پٹیل کی فیکٹری میں کام کرکے اچھی خاصی رقم بھی بناتے تھے جو کہ قانونی طور پر جرم تھا۔ اس طرح پکڑے جانے کی صورت میں انہیں سخت سزا ہوسکتی تھی۔ بھاری جرمانہ' قید یا دونوں چنانچہ ان تینوں کے لیے بھی قانون کی غیر جانب دار نظروں سے بچنا ازبس کہ ضروری تھا۔ دیپک پٹیل نے نظر رکھنے کی ذمے داری عبدل کے سپرد کی تھی کیونکہ وہ قابلِ بھروسا آدمی تھا۔ دیپک پٹیل کی فیکٹری اور اسٹور میں کیا کچھ ہیرا پھیری ہوتی ہے' وہ سب کچھ جانتا تھا۔ کتنے لوگ بغیر کارڈ کے غیر قانونی طور پر کام کررہے ہیں۔ کتنے لوگ تنخواہ دکھا کر سوشل سیکیورٹی سے ناجائز سہولتیں حاصل کررہے ہیں اور خود دیپک پٹیل حساب کتاب میں کتنی گڑبڑ کررہا ہے تاکہ ناجائز طور پر ٹیکس بچا سکے' عبدل کو ہر بات کی خبر تھی لیکن خود علی کی سمجھ میں "نظر رکھنے" کا مطلب نہیں

آیا تھا چنانچہ ایک دن اس نے عبدل کو پکڑ لیا۔

"چھاپا پڑ جاتا ہے یار۔"

"چھاپا۔" علی نے الجھ کر کہا "کیسا چھاپا؟"

وہ دونوں اس وقت کینٹین میں بیٹھے تھے۔ چائے کے کپ سامنے رکھے تھے۔ ہاتھوں میں سلگتی ہوئی سگریٹیں تھیں۔ کینٹین میں چونکہ اور کوئی نہیں تھا لہٰذا وہ آزادی اور اطمینان سے گفتگو کر سکتے تھے۔ علی نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ پھر کہنے لگا "دیکھو غیر قانونی طور پر چوری چھپے کام تو پہلے بھی اکثر لوگ کرتے تھے اور صرف کالے ہی نہیں، گورے بھی کرتے تھے۔ مگر اب یہ رجحان کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے۔ پھر ایسے بے شمار لوگ بھی جو باہر سے آئے ہیں ویزے پر یا غیر قانونی طور پر، ان لوگوں کو بھی کام کرنے کا قانونی طور پر کوئی حق نہیں۔ حکومت پہلے تو کچھ چشم پوشی سے کام لیا کرتی تھی مگر اب سختی بڑھ گئی ہے۔ حکومت غیر قانونی طور پر کام کرنے والوں کو پکڑنے کے لیے سخت اقدامات کرتی ہے۔ آئے دن فیکٹریوں، ہوٹلوں اور اسٹوروں وغیرہ میں چھاپے پڑتے ہیں اور ناجائز طور پر کام کرنے والے پکڑے جاتے ہیں۔ جو یہاں کے شہری ہوں، انہیں سزا ملتی ہے۔ جو غیر ملکی ہوں، انہیں مقدمہ چلانے کے بعد واپس بھیج دیا جاتا ہے۔"

"وہ تو میں سمجھ گیا۔" علی نے کہا "لیکن دیپک پٹیل نے تم سے نظر رکھنے کے لیے کیوں کہا، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

عبدل نے چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی "دیکھو، ہوتا یہ ہے کہ محکمۂ امیگریشن والے یا سوشل سیکیورٹی کے آدمی کسی بھی دن، کسی بھی وقت اچانک وارد ہوتے ہیں۔ وہ سادہ لباس میں ہوتے ہیں اور بغیر اطلاع کے آتے ہیں۔ جب وہ آتے ہیں تو سب سے پہلے میری نظر ان پر پڑتی ہے۔ کیونکہ میری مشین بیرونی کمرے میں کھڑکی کے پاس ہے۔ کھڑکی سے نیچے پورا کاریارک صاف دکھائی دیتا ہے۔ جب وہ لوگ آتے ہیں اور میں انہیں دیکھتا ہوں تو لپک کر یہاں بڑے شیڈ میں آتا ہوں اور زور سے ہاتھ ہلاتا ہوں۔ ہاتھ کے اشارے کا مطلب ہے، بھاگو۔ پھر میں لپک کر واپس اپنی مشین پر چلا جاتا ہوں... تاکہ انہیں شبہ نہ ہو۔ پھر جتنی دیر میں وہ لوگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر بیرونی کمرے میں پہنچتے ہیں، اتنی دیر میں یہاں سے وہ لوگ جو ناجائز طور پر کام کر رہے ہیں، فرار ہو جاتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے عقبی سیڑھیوں سے؟" علی نے پوچھا۔

"ہاں۔" عبدل نے کہا "میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں، وہ سیڑھیاں ٹوائلٹ کی بغل میں ہیں اور نیچے عقبی گلی میں نکلتی ہیں۔ تمہیں ہر وقت ہوشیار رہنا ہوگا۔ جب بھی تم مجھے دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھو، سارا کام فوراً چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف بھاگو۔ ایک منٹ کی تاخیر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ نیچے پہنچ کر بائیں طرف بھاگو اور سیدھے پارک تک چلے جاؤ۔ وہاں سے بس یا ٹیکسی پکڑو اور گھر کا رخ کرو۔ ایک بات اور یاد رکھو۔ اگر چھاپے کی وجہ سے ایک بار یہاں سے بھاگنا پڑے تو پھر کام پر آنے کی ضرورت نہیں۔ گھر پر ہی انتظار کرنا پڑے گا۔ دو چار دن بعد دیپک پٹیل خود ہی بتائے گا کہ کب کام پر آنا ہے۔"

علی گم صم بیٹھا تھا اور سراسیمہ نظروں سے عبدل کو دیکھ رہا تھا۔ جب وہ چپ ہوا تو علی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "یار عبدل بھائی یہ تو بڑی خوف زدہ کرنے والی بات ہے؟"

"ہاں ہے تو۔" عبدل نے جواب دیا "اور مشکل یہ ہے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔"

علی تھوڑی دیر چپ رہا اور پُرخیال نظروں سے عبدل کو دیکھتا رہا۔ پھر ذرا تجسس کے ساتھ پوچھا "تو کیا یہ چھاپے آئے دن پڑتے رہتے ہیں؟"

عبدل نے سر ہلایا "اس سلسلے میں کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ ایک ہفتے میں دو بار آجاتے ہیں۔ اور کبھی تین چار ماہ تک ان کی شکل نظر نہیں آتی۔"

"کیا کبھی کوئی پکڑا بھی گیا ہے؟" علی کے لہجے کا تجسس کچھ اور گہرا ہو گیا۔

عبدل ہنسا۔ کپ اٹھا کر چائے کا آخری گھونٹ لیا پھر کہنے لگا "ہاں گزشتہ سال ایک آدمی پکڑا گیا تھا۔ کندن لال نام تھا۔ میں اس دن کام پر نہیں آیا تھا۔ اتفاق سے دیپک پٹیل بھی اس وقت موجود نہیں تھا۔ اچانک امیگریشن والے آگئے۔ کندن لال کو بھاگنے کا موقع نہیں مل سکا اور وہ دھر لیا گیا۔ کئی دن حوالات میں رہا پھر عدالت میں پیش ہوا اور پھر جہاز میں بٹھا کر واپس بھیج دیا گیا۔"

علی نے محسوس کیا کہ ایک سرد لہر اس کے جسم میں اوپر سے نیچے تک دوڑتی چلی گئی ہے۔ چند لمحے بعد اس نے کہا "دیپک صاحب تو بڑی مصیبت میں پڑ گئے ہوں گے۔"

عبدل طنزیہ انداز میں ہنسا "دیپک اور مصیبت.... ارے یار تم اسے نہیں جانتے۔ وہ سالا بہت چالاک ہے۔ کبھی کسی مصیبت میں نہیں پڑتا۔ اپنے بچاؤ کی اَن گنت ترکیبیں اسے ازبر ہیں۔ مکھن سے نکلنے والے بال کی طرح صاف بچ جاتا ہے۔"

علی کو حیرت ہوئی۔ اسے گمان تک نہیں تھا کہ عبدل دیپک پٹیل کے بارے میں ایسے عامیانہ الفاظ استعمال کرے گا۔ اس کے خیال میں دیپک پٹیل ایک اچھا آدمی تھا۔ ضرورت مندوں کی مدد کرتا تھا۔ ایسے لوگوں کو بھی کام دے دیتا تھا جنہیں قانونی طور پر کام کرنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ وہ چند لمحے استعجاب آمیز نظروں سے عبدل کو دیکھتا رہا پھر سر ہلا کر بولا "یار عبدل بھائی، تمہیں دیپک صاحب کے بارے میں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"بھئی وہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ قانون کا خطرہ مول لے کر ضرورت مندوں کو نوکری دیتے ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ اچھے

آدمی ہیں۔"

عبدل کے ہونٹوں پر ایک استہزائی ہنسی ابھری۔ پھر اس نے تیکھے لہجے میں کہا "ابھی تم نئے ہو۔ اس لیے تمہیں اس میں خوبیاں نظر آرہی ہیں مگر ذرا انتظار کرو۔ تین چار ماہ اگر یہاں ٹک گئے تو تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ وہ کتنا اچھا آدمی ہے اور ضرورت مندوں کی کتنی مدد کرتا ہے۔"

علی چپ رہا اور الجھی ہوئی نظروں سے عبدل کو دیکھتا رہا۔

سات دن پورے ہوئے۔ سات طویل' جانکاہ' اعصاب شکن دن پورے ہوئے۔ یوں جیسے سات سال یا سات صدیاں گزری ہوں۔ اس نے ایک ایک پل گن کر گزارا تھا... کیونکہ اس کی جیب خالی تھی۔ بشیر احمد اور منظور احمد بیدل سے قرض لے کر گزارہ ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ اسے گھر کی طرف سے بھی تردد تھا۔ پتا نہیں اماں اور بھائی بہن کس حال میں ہوں گی۔ گو اس نے روانگی کے وقت کچھ رقم کا بندوبست کر دیا تھا۔ مگر اسے علم تھا کہ وہ رقم کافی نہیں تھی۔ چند ہی دنوں میں ختم ہو گئی ہوگی۔ اب یہ بہت ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد روپیہ بھیجے اور باقاعدگی سے بھیجے۔ نہ صرف گھر کے اخراجات کے لیے بلکہ اس قرض کی ادائیگی کے لیے بھی جو اس نے برطانیہ آنے کے لیے لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آٹھویں دن اس نے دیپک پٹیل کے آفس میں قدم رکھا اور دیپک پٹیل نے اس کی پہلی تنخواہ کی ادائیگی کی تو نوٹ ہاتھ میں سنبھالتے وقت اس کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی۔ دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ بدن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں بھی ابھر آئی تھیں۔ نوٹ سنبھال کر وہ دفتر سے باہر آیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چپ چاپ' آس پاس سے بے خبر اور دس اور پانچ کے نوٹوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے اٹھاسی گھنٹے کے بجائے بانوے گھنٹے کام کیا تھا۔ یعنی چار گھنٹے زیادہ۔ کل ایک سو پندرہ پاؤنڈ ملے تھے۔ ایک سو پندرہ پاؤنڈ' برطانوی کرنسی' برطانیہ میں اس کی پہلی کمائی۔ اس سے اسے وہ نوٹ بے حد خوب صورت لگے۔ دلکش' دل ربا اور سحر انگیز۔ ان کی رنگت' ان کا ڈیزائن اور ان کے اوپر لکھی ہوئی تحریر اور پانچ اور دس کا ہندسہ۔ انہی نوٹوں کے خواب اس نے دیکھے تھے۔ ہزاروں میل کا سفر کیا تھا۔ خطرات مول لیے تھے اور جان جوکھم میں ڈالی تھی۔ پاؤنڈ اسٹرلنگ' ملکہ کی تصویر والے نوٹ' ایک بار وہ برطانیہ پہنچ جائے اور ملکہ کی تصویر والے نوٹ کمانے لگے تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ اور اب ملکہ کی تصویروں والے نوٹ اس کے ہاتھ میں ہیں۔ پورے ایک سو پندرہ پاؤنڈ۔ وہ یکایک مسکرایا۔ ایک جوش آمیز مسرت سے اس کا سارا وجود لبریز ہو گیا۔ یوں محسوس ہوا' جیسے اسے ایک سو پندرہ پاؤنڈ نہ ملے ہوں' ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ اس نے یکایک جھک کر نوٹوں کو چوما اور تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔

اگرچہ شام کے ساڑھے سات ہی بجے تھے مگر رات کی گہری سیاہ چادر چاروں اور پھیل چکی تھی۔ انگلینڈ میں موسم سرما میں دن بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ سات بجے کے بعد صبح کا اجالا نمودار ہوتا ہے..... چار بجے شام سے اتنا اندھیرا ہو جاتا ہے کہ رات کا گمان ہوتا ہے۔ مگر اندھیرا پھیلنے کے باوجود بازار جاگ رہا تھا۔ دکانیں اگرچہ زیادہ تر بند ہو چکی تھیں مگر شراب خانے' ڈسکو.... کلب کھلے ہوئے تھے۔ یہاں وہاں ایک آدھ اسٹور اور آف لائسنس دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ بس اسٹاپ پر نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہجوم تھا' خوش باش' خوش پوشاک۔ اس نے پسندیدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ پھر اس کی نظر ایک فربہ اندام مگر بے حد دلکش عورت پر پڑی۔ جو فٹ پاتھ پر اس کے قریب سے گزر رہی تھی۔ عورت نے اس کی جانب دیکھا اور خوش دلی سے مسکرائی۔ جواب میں وہ بھی مسکرایا۔

پھر وہ ایک کارنر شاپ میں گھس گیا۔ ایمبیسی سگریٹ کی ڈبیا خریدی۔ ڈبیا ہاتھوں میں لے کر پانچ پاؤنڈ کا نوٹ دکان دار کو دیتے ہوئے اسے ایک انوکھی مسرت کا احساس ہوا جس میں جوش بھی تھا اور احساسِ فخر بھی۔ انگلستان میں اتنے دن ہو گئے تھے لیکن یہ پہلا موقع تھا' جب وہ اپنی کمائی سے' اپنی محنت کی گاڑھی کمائی سے سگریٹ خرید رہا تھا۔ پانچ کا وہ نوٹ جو اس نے دکان دار کو دیا' ادھار لیا ہوا نہیں تھا بلکہ اس نے چار گھنٹے محنت سے کام کر کے خود کمایا تھا.... یہ ایسا احساس تھا جس کا ادراک اسے زندگی میں شاید پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس احساس میں سرشاری بھی تھی' طمانیت بھی اور اپنی ذات کا اعتبار بھی۔ اس کی نظروں میں خود اپنی قدر و قیمت یکایک بڑھ گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی اہم ہستی ہے۔ اہم اور باوقار' اس نے یہ دونوں لفظ زیرِ لب دہرائے اور مسکرایا۔

شاپ سے باہر آکر اس نے پیکٹ کھولا اور ایک سگریٹ سلگائی۔ جب سے آیا تھا۔ برٹش سگریٹ ہی پی رہا تھا۔ کبھی بنسن اینڈ ہیجز' کبھی روتھ مین اور کبھی ایمبیسی۔ مگر ایسی فرحت' تازگی اور لذت اسے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی جیسی اس وقت ہوئی۔ تمباکو کی مہک سے اس کے مشامِ جاں معطر ہو گئے۔ زبان پر ایک انوکھا' فرحت بخش اور نشاط آمیز ذائقہ گھلتا چلا گیا۔ اس نے دو تین گہرے کش لیے' سرشار ہو کر مسکرایا اور آگے بڑھا۔

گھر پہنچا تو خاموشی اور سناٹے نے استقبال کیا۔ دو تین کمروں کی بتیاں روشن تھیں' مگر کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ اس نے سیڑھیاں طے کیں اور پہلی منزل پر پہنچا۔ منظور احمد بیدل اپنے کمرے کے باہر قالین پر بیٹھا اردو اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ سامنے الیکٹرک ہیٹر دھرا تھا اور چائے کا کپ۔ یکایک اس کے اندر چائے کی خواہش جاگ پڑی۔ بہت دیر سے اس نے چائے نہیں پی تھی۔ چنانچہ وہ منظور احمد بیدل کے سلام کا جواب دے کر باورچی خانے میں گھس گیا۔ ایک پیالی چائے تیار کی۔ پھر پیالی لے کر اوپر

اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں اندھیرا تھا اور خاموشی اور سردی۔ اس نے سوئچ آن نہیں کیا۔ صرف ہیٹر جلانے پر اکتفا کیا۔ پھر عقبی کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ چائے کا گھونٹ لے کر پیالی چوکھٹ پر رکھ دی اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ برآمد کیا۔ وہی پیکٹ جو اس نے خود اپنی کمائی سے خریدا تھا۔ پھر ایک سگریٹ جلائی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان سیاہ بادلوں کے عقب میں غائب تھا۔ دور تک مکانوں کی سیاہ چھتوں اور ٹی وی ایریل کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں کسی چمنی سے گہرا سرمئی دھواں نکل کر فضا میں کاہلی سے پھیل رہا تھا۔ وہ قدرے مسرور نظروں سے اس پورے منظر کو جو ایک پینٹنگ کی طرح نظر آتا تھا' دیکھتا رہا۔ وہ انبساط اور جوش کی کیفیت اس پر ابھی تک طاری تھی' جو اس نے ایک سو پندرہ پاؤنڈ لیتے وقت محسوس کی تھی۔ اس نے یکایک مسکرا کر جیب میں ہاتھ ڈالا' نوٹ نکالے اور ایک بار پھر انہیں گنا۔ پھر خود بخود اس کے ذہن نے ان نوٹوں کو اپنے ملک کی کرنسی میں تبدیل کیا اور حیران ہوا۔ ارے' اتنی رقم اور وہ بھی صرف ایک ہفتے میں' سات دن۔ اتنی رقم تو وہ اپنے ملک میں ڈیڑھ دو ماہ میں مشکل سے کما پاتا تھا۔ وہ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات میں گھرا ہوا نوٹوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ کتنے کام رکے پڑے ہیں؟ کتنے مسائل سر پر ہیں۔ اور کتنی ذمے داریاں شرمندۂ تکمیل ہونے کی منتظر ہیں۔ بھائی کی تعلیم' بہنوں کی شادیاں اور ایک معقول سا' خوب صورت سا ذاتی گھر۔ ساری زندگی کرائے کے مکان میں گزر گئی۔ کبھی کوئی ایسا جھونپڑا تک نصیب نہ ہوا جسے وہ اپنا کہہ سکتا۔ لیکن اب یہ ممکن ہے۔ اگر اتنا روپیہ اسے ہر ہفتے ملتا رہے تو ہر خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ دو تین سال کے اندر ہی وہ نہ صرف بہنوں کے گھر بسا سکے گا اور چھوٹے بھائی کو کالج بھیج سکے گا بلکہ ذاتی گھر بنانے کی داغ بیل بھی ڈال دے گا۔ ذاتی گھر' یہ تصور اتنا سنسنی خیز تھا کہ اس کے رگ و پے میں ایک تیز سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ دل سرخوشی سے بھر گیا۔ اپنا گھر! اس نے زیرِ لب یہ دو لفظ دہرائے اور خوش ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔

مگر پھر معاً اس کا دل بیٹھنے لگا۔

جاگتے کے سپنے شاید ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بے بنیاد اور ناپائیدار' سگریٹ کے دھوئیں کی طرح جو فضا میں اٹھتا ہے' چکراتا ہے اور دھیرے دھیرے معدوم ہو کر تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس نے ایک سو پندرہ پاؤنڈ کو اپنے ملک کی کرنسی میں تبدیل کر کے لمبے چوڑے منصوبے تو بنا ڈالے مگر یہ نہیں سوچا کہ یہ رقم بے شک اس کے ملک میں تو خاصی بڑی ہے لیکن برطانیہ میں نہیں ہے۔ یہاں کے اخراجات زیادہ ہیں۔ اس کے پاس آخر بچے گا کیا۔ اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ پچیس پاؤنڈ کرائے کے' منظور احمد بیدل اور بشیر احمد کا قرضہ۔ پھر وہ کم بخت ڈیوڈ بھی آئے گا۔ ہر ماہ اسے بھی کچھ نہ کچھ دینا ہوگا۔ انگلستان کے سفر کے لیے جو رقم طے ہوئی تھی' اس نے وہ پوری رقم نہیں دی تھی۔ نصف سے کچھ زیادہ رقم ادا کی تھی اور باقی رقم کے لیے اس نے وعدہ کیا تھا کہ انگلینڈ میں ملازمت کر کے رفتہ رفتہ ادا کر دے گا۔ ڈیوڈ اور اس کے ایجنٹ اس نوعیت کا سمجھوتا نہیں کرتے تھے مگر اس کے ساتھ رعایت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ انہیں دھوکا نہیں دے سکتا۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ چنانچہ وہ کہیں روپوش بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ بہرحال اسے تلاش کر لیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ وہ باقی ماندہ رقم کی ادائیگی رفتہ رفتہ کر دے۔ تو گویا کچھ نہ کچھ رقم ان کے لیے بھی ہر ہفتے نکالنا ہوگی۔ پھر اپنے روزانہ کے اخراجات بھی ہیں۔ اس نے سرسری طور پر اندازہ لگایا تو احساس ہوا کہ ستر پچھتر پاؤنڈ ہر ہفتے نکل جائیں گے۔ تو پھر بچے گا کیا؟ کتنی رقم وہ اماں کو بھیج سکے گا۔ شاید اتنی بھی نہیں' جتنی وہ وہاں رہ کر کماتا تھا۔ تو پھر وہ سپنے کیسے پورے ہوں گے۔ جن کی تعبیر کی جستجو میں وہ یہاں آیا ہے۔ جب تک قرضہ نہ اتر جائے اور آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہو' تب تک کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرضہ کب اترے گا؟.... کہیں ایسا نہ ہو کہ فصلِ گل آتے آتے منہ پھیر کر کہیں اور چلی جائے۔

اس نے افسردہ اور درماندہ نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سامنے والے مکان کی چھت پر ایک کبوتر آ کر بیٹھا' تنہا' اداس' گمشدہ۔ کہیں دور سے گھنٹیوں کی مغموم آواز ابھری۔ نیچے گلی میں ایک بلی زور سے روئی۔

اس نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔

○☆○

عبدل نے کہا تھا' ابھی تم نئے ہو اس لیے دیپک میں تمہیں خوبیاں نظر آتی ہیں مگر ذرا انتظار کرو۔ دھیرے دھیرے جان جاؤ گے کہ وہ کتنا اچھا آدمی ہے۔ دھیرے دھیرے وہ واقعی جان گیا کہ دیپک کتنا اچھا آدمی ہے۔ دھیرے دھیرے دیپک کی باطنی "خوبیاں" اس پر ظاہر ہوئیں اور اسے پتا چلا کہ دیپک دراصل ایک خود غرض' موقع پرست اور چالاک آدمی ہے۔ رقم کے حصول کے لیے وہ ہر کام کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ غیر قانونی طور پر کام کرنے والوں کو ملازمت کسی ہمدردی اور مدد کے جذبے سے نہیں دیتا تھا... بلکہ مالی فائدے کے حصول کی نیت سے دیتا تھا۔ غیر قانونی طور پر کام کرنے والوں کے لیے اس نے ایک پاؤنڈ پچیس پنس اُجرت مقرر کر رکھی تھی جو کہ عام اجرت کے مقابلے میں پچاس فیصد سے بھی کم تھی۔ دیپک پٹیل جانتا تھا کہ غیر قانونی اور ناجائز طور پر کام کرنے والوں کے پاس اور کوئی چارہ نہیں۔ اگر انہیں چند پاؤنڈ کمانے ہیں تو وہ کم اُجرت قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ ایک طرح سے کھلی ہوئی بلیک میلنگ تھی۔ لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا رویہ ایک دیپک پٹیل نے ہی نہیں دوسروں نے بھی

اختیار کر رکھا تھا۔ ہر جگہ یہی صورت تھی۔ ہوٹل ہوں' اسٹور اور فیکٹریاں ہوں یا مارکیٹ وغیرہ۔ سبھی جگہ کم سے کم اُجرت دیتے تھے۔ اور اس میں ایشین ہی نہیں' انگریز' آئرش' یہودی سبھی شامل تھے۔ بعض جگہ تو صرف ایک پاؤنڈ ہی اُجرت ملتی تھی۔ علی نے حساب لگایا اور یہ جان کر اسے شدید حیرت اور صدمہ ہوا کہ اگر وہ باضابطہ طور پر کسی فیکٹری میں کام کرے تو اٹھاسی گھنٹے کا معاوضہ اسے کم از کم دو سو چونسٹھ پاؤنڈ ملے گا۔ جبکہ دیپک پٹیل اسے صرف ایک سو دس پاؤنڈ دیتا تھا۔ گویا ایک سو چون پاؤنڈ کم۔ یہ صریحاً ظلم بلکہ ڈاکا زنی تھی۔ مگر علی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اگر کوشش کرتا تو بھی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی حالت تو اس بھیڑ کی سی تھی جسے شیپ ڈاگ کھدیڑتا پھرتا ہے اور بھیڑ کچھ نہیں کرپاتی۔ وہ بھی مجبور ہے کہ جب تک "شیپ ڈاگ" سے چھٹکارا نہ ملے' وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اسے انتظار کرنا ہوگا۔ ابھی وہ کچھ نہیں جانتا۔ نہ اس کی واقفیت زیادہ ہے۔ ذرا کچھ وقت گزرے' کچھ معلومات حاصل ہوں تو پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھے گا۔ کوئی دوسری فیکٹری یا اسٹور' اور پھر دیپک پٹیل کی ملازمت چھوڑ دے گا۔ کسی ایسی جگہ کام کرے گا' جہاں اسے کم از کم دو پاؤنڈ فی گھنٹا اُجرت تو ملے۔ تبھی وہ اس قابل ہوسکے گا کہ اپنے مسائل سے نمٹ سکے۔

انگلستان میں غیر قانونی طور پر آنے والے کیسی پریشانیوں اور آفتوں سے کسی بھی وقت دوچار ہوسکتے ہیں' اس کا ایک اور اندازہ علی کو اس وقت ہوا' جب ایک شام اسے جانی نے اچانک روک لیا۔

جانی ایشین تھا لیکن اپنے اصل نام کے بجائے جانی کہلوانا زیادہ پسند کرتا تھا۔ دیپک پٹیل کی فیکٹری میں اسے کام کرتے ہوئے کئی سال ہوگئے تھے۔ عام طور پر فیکٹری میں کام کرنے والے اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ خاصا اوباش اور خود پرست آدمی تھا۔ شراب' جوا اور عورت اس کی زندگی کے محور تھے۔ کئی سال ہوئے اپنی بیوی کو' جو بعض لوگوں کے بیان کے مطابق' بہت نیک' گھر گرہست اور ذمّے دار ایشین عورت تھی' چھوڑ چکا تھا۔ اور اب ایک ایسی سفید فام عورت کے ساتھ رہتا تھا جو اس سے عمر میں پندرہ سال بڑی تھی اور کچھ دن پہلے تک ریڈ لائٹ ایریا میں باقاعدہ دھندا کرتی تھی۔ عبدل نے علی کو جانی سے دور رہنے اور زیادہ تعلقات نہ بڑھانے کی خصوصی تاکید کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب جانی نے آواز دے کر علی کو روکا تو اسے تذبذب ہوا۔ کیا بات ہے؟ جانی نے اسے کیوں روکا ہے۔ اس نے شش و پنج کی حالت میں جانی کے گہرے سیاہ چہرے کو گھورا۔

"کیا بات ہے۔"

"کچھ نہیں یار۔" جانی نے بے تکلفی اور خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا "میں نے سوچا تم بس اسٹاپ کی طرف جارہے ہو تو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ ذرا دو باتیں کرلیں گے۔۔۔ سگریٹ پیو گے؟"

"نہیں۔" علی نے خشک لہجے میں کہا "اور میں بس اسٹاپ پر نہیں' گھر جارہا ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے بھئی۔ سڑک تک ساتھ ہی چلتے ہیں۔ وہاں سے تم گھر چلے جاؤ' میں بس پکڑلوں گا۔"

علی نے غور سے جانی کو دیکھا تھا۔ جانی درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ رنگ سیاہ' سر پر چھوٹے چھوٹے بال اور آنکھوں میں سرخ لکیریں جو کثرتِ شراب نوشی کا نتیجہ تھیں۔ علی نے زور سے سانس لے کر کہا "تم مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہو۔"

"کچھ خاص نہیں یار' بس یونہی' خیر خیریت۔" جانی نے ہنس کر کہا اور زور سے سگریٹ کا کش لیا "یہاں تمہیں سردی تو بہت لگتی ہوگی۔ ہے نا۔"

علی نے تجسس آمیز نظروں سے جانی کو گھورا "ہاں لگتی تو ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ دھیرے دھیرے عادت پڑجائے گی۔ میں بھی جب آیا تھا تو ہر وقت کانپتا رہتا تھا۔" جانی نے کہا "ویسے ایک بات ہے یار' تم نے واقعی بڑی ہمت کی۔"

"کیسی ہمت؟"

"یہی انگلینڈ آنے کی۔" جانی کے لہجے میں بے پروائی تھی۔ "اس طرح اس ملک میں آنا کوئی آسان بات نہیں۔ تم اسمگل ہو کے آئے ہو نا۔"

علی چپ رہا تو جانی نے اس کے شانے پر بے تکلفی سے تھپکی دی اور بات آگے بڑھائی "ارے یار مجھے سب معلوم ہے۔ تم گھبراتے کیوں ہو۔ میں تو تمہارا دوست ہوں۔"

"مگر تم یہ باتیں کیوں کررہے ہو۔" علی کی آواز میں خوف کا عنصر تھا۔ وہ مضطرب نظروں سے جانی کو دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں' میں تو بس یہ سوچ رہا تھا کہ اگر پولیس یا امیگریشن والوں کو پتا چل جائے تو کیا ہوگا۔ تم تو بڑی مشکل میں پڑجاؤ گے۔ ہے نا۔ گرفتاری' مقدمہ' جیل اور پھر واپسی۔ یہ لوگ بڑے باسٹرڈ ہیں۔ بدے۔۔۔ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے۔"

"مگر انہیں کیسے پتا چلے گا؟" علی نے سہمے ہوئے مگر متجسس لہجے میں کہا۔

"یار تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔" جانی کہنے لگا "یہ کتے کے بچے بڑے حرامی ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ سورسز ہیں ان کے۔ کسی نہ کسی طرح یہ لوگ پتا لگا ہی لیتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی انہیں اطلاع دے دے۔"

علی کا دل زور سے دھڑکا۔ سارے بدن میں ایک ٹھنڈی لہر دوڑتی چلی گئی۔ اس نے قدرے سراسیمہ نظروں سے جانی کے سیاہ چہرے کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ علی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "کون اطلاع دے گا؟"

"کوئی بھی۔" جانی کی آواز سے بے مہری ٹپک رہی تھی۔

علی چند لمحے چپ رہا اور جلتی ہوئی نظروں سے جانی کو دیکھتا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ شاید گردن پر پسینے کی نمی ابھر آئی تھی۔ اسے شک ہو رہا تھا کہ شاید وہ جانی کی نیت کو سمجھ رہا ہے۔ چنانچہ قدرے توقف کے بعد اس نے پست مگر تلخ آواز میں کہا "تو پھر؟"

"یار تم مجھے غلط مت سمجھنا۔" جانی کہنے لگا "میں تو تمہارا بھائی ہوں اور تمہارا بھلا ہی چاہتا ہوں۔ تم شوق سے رہو یہاں۔ ہزاروں لاکھوں کماؤ اور عیش کرو۔ میں ایسی کوئی بات کرتا تو نہیں ہوں۔ لیکن کیا ہے کہ آج کل ذرا پریشان ہوں۔ بڑی کڑکی ہے۔ لہٰذا تم ایسا کرو کہ مجھے پانچ سو پاؤنڈ دے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی زبان ہمیشہ بند رکھوں گا۔ یہ جانی کی زبان ہے اور جانی جب کوئی پرامس کرتا ہے تو ہمیشہ پورا کرتا ہے۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"پانچ سو پاؤنڈ؟"

"ہاں۔"

علی نے بے کسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ فٹ پاتھ پر دور تک کہیں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ سامنے' سڑک کے دوسری جانب ایک عورت ایک دکان کے سائبان کے نیچے کھڑی شاید کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ علی نے گردن گھمائی اور جانی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارے چمک اٹھے تھے۔ رگوں میں لاوا دوڑنے لگا تھا۔ طیش و نفرت کی شدت کے باعث کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ اس کے دل میں ایک خواہش ہاں صرف ایک خواہش اس وقت سانپ کی طرح سر اٹھا رہی تھی۔ یہ کہ آگے بڑھے اور جانی کو دبوچ لے اور اس کی گردن دباتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھیں ابل پڑیں اور زبان باہر نکل آئے۔ ہاں' اسے یہی کرنا چاہیے۔ بس بہت ہو چکا۔ کہاں تک ڈرے وہ' اور کس کس سے' ڈیوڈ اور چوہدری کرم داد اور پولیس اور امیگریشن اور پھر خود اپنی مجبوری اور بے کسی اور حالات کی فتنہ سامانی اور اب یہ کم بخت' ذلیل جانی' کس کس سے ڈرے وہ۔ نہیں اب اور نہیں ڈرے گا۔ بے کسی کے ہاتھوں میں اب اور کھلونا نہیں بنے گا۔ لعنت ہے۔ جو ہونا ہے' ہو جائے۔ لیکن وہ اس حرامی کی اولاد کو مار ڈالے گا۔ پھر کیا ہوگا۔ پکڑا جائے گا وہ۔ مقدمہ چلے گا' پھر پھانسی یا عمر قید۔ مگر انگلینڈ میں پھانسی نہیں ہوتی۔ تو گویا عمر قید ہوگی۔ ٹھیک ہے' وہ جیل چلا جائے گا۔ مگر اب اور نہیں ڈرے گا' اپنی ہی نظروں میں اور نہیں گرے گا مگر کیا وہ ایسا کر سکتا ہے؟

اس نے زور سے سانس لی۔ اپنے جسم کے اندر پکتے لاوے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور گہری تنفر آمیز نظروں سے جانی کو گھورا "اور اگر میں نہ دوں تو؟"

"تم اب ایسا نہیں کرو گے۔" جانی نے بے پروائی سے کہا "کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم واپس نہیں جانا چاہتے۔"

علی چپ چاپ کھڑا رہا اور جانی کو دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں میں نفرت بھی تھی اور طیش بھی' اور ساتھ ہی لاچاری اور بے بسی بھی۔ دھیرے دھیرے بے بسی غصے اور نفرت پر غالب آگئی۔ دماغ نے دل کو سمجھایا۔ مصلحت سے کام لو۔ تم جانی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم کسی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ چنانچہ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور خوشامد بھری نظروں سے جانی کو دیکھا۔

"جانی بھائی ایسا مت کرو۔"

"یار کمال ہے۔" جانی نے حیرت سے کہا "صرف پانچ سو پاؤنڈ کی تو بات ہے۔ ایک بار دے دو' بات ختم۔ میں کوئی بڑا مطالبہ تو نہیں کر رہا۔"

"دیکھو جانی۔" علی کی آواز رقت کی بنا پر بھرّا گئی "تم تو اپنی ہی طرف کے ہو۔ ایک طرح سے بھائی ہو۔ ایسا مت کرو۔ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا کوئی اچھی بات نہیں۔ میں بہت مجبور آدمی ہوں۔ بہت ذمے داریاں ہیں میری۔ بھائی' بہنیں اور.... اور پھر ڈھیر سارا قرضہ۔ پلیز ایسا مت کرنا۔"

جانی بے حیائی اور کمینے پن سے مسکرایا "یار صرف پانچ سو پاؤنڈ' اونلی فائیو ہنڈریڈ۔ یہ تو کوئی بڑی رقم نہیں۔ تم تو یہاں ہزاروں' لاکھوں کماؤ گے۔"

"مگر میرے پاس پانچ سو پاؤنڈ نہیں ہیں۔" علی نے بے بسی سے کہا۔

"تنخواہ ملی ہے آج؟" جانی نے پوچھا۔

علی نے استفہامیہ نظروں سے جانی کو دیکھا۔

"تو پھر ایسا کرو کہ بیس پاؤنڈ مجھے دے دو۔" جانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "اور آئندہ بھی ہر ہفتے بیس پاؤنڈ دیا کرو۔ یوں کچھ مہینوں میں پوری رقم ادا ہو جائے گی۔ اور یار تم گھبراؤ مت' میں تمہارا دوست ہوں۔ کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے تمہیں نقصان پہنچے۔ میں تو یہ رقم بھی نہ لیتا۔ مگر کیا ہے کہ ذرا مجبوری ہے۔ ویسے تم اطمینان رکھو۔ میری زبان ہمیشہ بند رہے گی۔ بلکہ اگر ضرورت پڑی تو میں تمہاری مدد کروں گا۔"

علی نے سوختہ نظروں سے جانی کو گھورا۔ دل ہی دل میں اسے ماں کی گالی دی پھر لرزتے ہاتھوں سے جیب سے بیس پاؤنڈ نکالے اور جانی کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"تھینک یو۔" جانی نے انتہائی تمسخرانہ آمیز انداز میں کہا اور مسکرایا۔

پھر جانی بس اسٹاپ کی طرف چلا گیا۔ علی وہیں کھڑا رہا اور کینہ توز نظروں سے جانی کو دیکھتا رہا۔ جتنی نفرت اور دشمنی اس وقت اس نے جانی کے لیے محسوس کی' اتنی شدید نفرت اس نے زندگی میں شاید کبھی کسی کے لیے محسوس نہیں کی تھی مگر اس کی نفرت میں ایک احساس بے بسی بھی موجود تھا۔ بے بسی کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ اس کی گاڑھے پسینے کی کمائی اس کے ہاتھ سے چھینی گئی ہے مگر وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر ہے۔ یونہی لوگ اسے لوٹتے رہیں گے

اور وہ لٹتا رہے گا۔ اس وقت پہلی بار اس کے دل میں ایک احساسِ شکست و ندامت جاگا۔ جس مصیبت میں وہ ہے' اس کا ذمے دار وہ خود ہی تو ہے۔ کاش اس نے یہ حماقت نہ کی ہوتی' کاش وہ اس طرح ناجائز طور پر انگلینڈ نہ آیا ہوتا۔

کچھ دیر میں جانی نظروں سے اوجھل ہوگیا تو اس نے بے بسی سے ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھکے ہارے قدموں سے اپنے جسم کا بھاری بوجھ گھسیٹنا شروع کیا۔

تین ہفتے تک اس نے جانی کو بلیک میلنگ کی رقم ادا کی۔ پھر گھبرا گیا۔ جب بھی وہ جانی کے ہاتھ پر دس دس کے دو نوٹ رکھتا' اسے شدید ذہنی اذیت کا احساس ہوتا۔ خود اپنی ذات کے لیے ایک حقارت سی پیدا ہوتی۔ وہ کتنا کمزور آدمی ہے۔ اپنی محنت کی کمائی ناجائز طور پر ایک بے ضمیر آدمی کے ہاتھ پر رکھ رہا ہے لیکن کچھ کرنے سے قاصر ہے۔ مگر جب چوتھا ہفتہ شروع ہوا تو اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اب ایک پیسہ بھی جانی کو نہیں دے گا۔ اگر جانی پولیس کو اطلاع دیتا ہے تو دے دے۔ اگر اسے سزا بھگتنی پڑی تو بھگت لے گا یا واپس چلا جائے گا لیکن جانی کو مزید کوئی رقم ادا نہیں کرے گا۔ اس طرح خوار ہونے سے تو کہیں بہتر ہے کہ واپس چلا جائے۔ اس فیصلے نے اسے خاصی تقویت پہنچائی۔ لیکن جب ہفتہ پورا ہوا اور تنخواہ ملی تو جانی سے انکار کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کیونکہ جانی کام پر نہیں آیا تھا اور کام پر نہ آنے کا سبب یہ تھا کہ وہ پولیس کی حراست میں تھا۔ اس کے ایک واقف کار سے جو فیکٹری ہی میں کام کرتا تھا' تفصیلات کا علم ہوا۔ پتا چلا کہ ایک دن پہلے پولیس نے اسے عین اس وقت رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا جب وہ ایک شراب خانے کے باہر کوکین یا ہیروئن بیچنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ عورت ٹیری بھی اس کے ساتھ ہی گرفتار ہوئی تھی جس کے ساتھ وہ رہتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ممنوعہ ڈرگ کی اچھی خاصی مقدار ان دونوں کے پاس سے برآمد ہوئی تھی۔ نہ صرف یہی بلکہ ٹیری کے پرس سے بنا لائسنس کا ایک پستول بھی پولیس کے ہاتھ لگا تھا۔ جانی کے ساتھی نے جس کا نام پاٹھک تھا' غصے سے کہا۔

"میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ ایک دن اس سالے کا یہی انجام ہوگا۔"

"تو کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ منشیات بیچتا تھا؟" ایک ورکر نے پوچھا۔

"ارے یار کیول نشے والی ڈرگز ہی نہیں بیچتا تھا اور بھی بہت کچھ کرتا تھا وہ۔" پاٹھک نے جو اتر پردیش کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا' مزید غصے سے کہا "میں نے تو کئی بار سمجھایا تھا اسے' مت کر یہ سب کچھ' چھوڑ دے سارے بُرے کام۔ میں نے تو اس سے یہ بھی کہا تھا کہ واپس چلا جا کچھ عرصے کے لیے۔ وہاں تیری بوڑھی ماں تیری راہ دیکھ رہی ہے۔ مگر اس نے ایک نہیں سنی۔ جوئے' شراب اور عورت کے چکر میں پڑ کر برباد ہوگیا۔"

"لیکن یار پاٹھک' وہ تو یہاں نوکری کرتا تھا۔ پھر یہ ڈرگز وغیرہ کا چکر کیوں؟" عبدل نے حیرت سے کہا۔

پاٹھک نے زور سے سر ہلایا "ارے بھیا یہ نوکری تو کیول ایک آڑ تھی قانون کو دھوکا دینے کی۔ ورنہ جو پیسہ اسے یہاں سے ملتا تھا اس میں اس کا کیا پورا پڑتا۔ اتنے پیسوں میں تو ان دونوں کا شراب کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا تھا۔ پھر باقی خرچہ کیسے چلتا۔ اسی لیے تو وہ دونوں دوسرے بُرے دھندے بھی کرتے تھے۔ حتیٰ کہ کبھی کبھار چوری بھی۔"

"چوری بھی!" پہلا ورکر حیرت سے بولا۔

"ہاں بھیا۔" پاٹھک نے بیزاری سے کہا "گردن تک دھنسا ہوا تھا دلدل میں' آخر ایک دن تو ڈوبنا ہی تھا۔"

"تو اب کیا ہوگا۔ ضمانت وغیرہ تو ہوجائے گی نا؟" معاً علی نے پوچھا اور یہ سوال اس نے ایک خاص نیت سے کیا تھا۔

"مشکل ہے۔" پاٹھک نے خشک لہجے میں جواب دیا "جانی تو پہلے بھی ایک دو بار گرفتار ہوچکا تھا۔ اس بار معاملہ ذرا سیریس ہے۔ پولیس نے گرفتاری کے بعد اس کے فلیٹ پر بھی چھاپا مارا تھا اور وہاں انہیں کئی غیر قانونی چیزیں ملیں۔ مثلاً کئی بڑے چاقو' بلو فلموں کے ویڈیو' فحش تصویریں وغیرہ۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی ضمانت نہیں ہوسکے گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کی ضمانت دے گا کون؟ نہیں بھیا' اس بار تو مجھے لگتا ہے کہ وہ دونوں لمبے عرصے کے لیے اندر گئے۔"

علی نے اپنے دل میں ایک اطمینان سا محسوس کیا۔

جانی کی گرفتاری کا مطلب تھا کہ اب علی کو اسے بیس پاؤنڈ ہفتہ نہیں دینا پڑیں گے۔ یہ بات باعثِ اطمینان تھی۔ تاہم یہ اطمینان سطحی اور کمزور تھا۔ ایک فکر اور تشویش مسلسل دامن گیر رہی۔ جانی کا کیا بھروسا' وہ تو ایک لفنگا' اوباش اور اخلاق سے عاری آدمی ہے۔ بے شک حوالات میں ہے تو کیا ہوا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی وقت جھنجلاہٹ میں یا کسی اور اندرونی تحریک کے زیرِ اثر وہ پولیس کو علی کے بارے میں سب کچھ بتادے۔ انتقام کا جذبہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ آدمی جب کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو اس کے اندر ہیجان اور غصہ جنم لیتا ہے اور وہ لاشعوری طور پر اپنا ذہنی خلجان اور غصہ کسی دوسرے آدمی پر اتارنا چاہتا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ دوسرا آدمی اس کے مصائب کا ذمے دار نہیں۔ یہ انتقام کی ایک دوراز کار اور بالواسطہ شکل ہے۔ بظاہر غیر متعلق' جس کا احساس و ادراک خود بدلہ لینے والے کو اکثر نہیں ہوتا۔ دراصل اس کے ذہن کے کسی نہاں گوشے میں یہ احساس کارفرما ہوتا ہے کہ میں مصیبت میں ہوں تو دوسرے کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔ علی کو بھی خوف لاحق رہتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جانی بھی کسی وقت کسی ایسے ہی جذبے سے مغلوب ہو کر زبان کھول دے۔ اور پھر پولیس دندناتی ہوئی فیکٹری میں آدھمکے۔ مگر دن ایک ایک کرکے گزر گئے۔

علی کا خدشہ اور خوف بے بنیاد نکلے۔ جانی کے بارے میں اسے اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اسے عدالت میں پیش کیا گیا اور صرف ایک ہفتے میں فیصلہ ہوگیا۔ ثبوت بھی اس کے خلاف تھے اور گواہ بھی۔ چنانچہ جانی اور ٹیری دونوں کو طویل عرصے کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

علی نے جب برطانیہ کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو خوف اسے مکمل طور پر گھیرے ہوئے تھا۔ محاورتاً اسے اپنے سائے تک سے ڈر لگتا تھا۔ راستہ چلتے ہوئے وہ لوگوں کو دیکھتا تو ہر دوسرا آدمی اسے مشکوک نظر آتا۔ یوں محسوس کرتا جیسے ہر دوسرا آدمی خفیہ پولیس سے تعلق رکھتا ہے اور علی کی تلاش میں ہے۔ ایک دھڑکا سا لگا رہتا کہ کوئی نہ کوئی کسی دن مخبری کردے گا اور اسے اچانک گرفتار کرلیا جائے گا۔ حد یہ ہے کہ چوہدری کرم داد کے مکان میں رہنے والے افراد بھی اسے قابلِ بھروسا نہیں لگتے تھے۔ مگر جوں جوں وقت گزرا' اس کے خوف اور بے یقینی میں رفتہ رفتہ کمی ہوئی اور وہ اپنے دل میں زیادہ اعتماد محسوس کرنے لگا۔ دو ماہ گزر گئے۔ پورے آٹھ ہفتے۔ ان ساٹھ دنوں میں اس کا حوصلہ اس حد تک بڑھا کہ دو تین مرتبہ وہ بشیر احمد اور منظور احمد بیدل کے ساتھ اتوار کی چھٹی میں شہر سے باہر گھومنے بھی گیا۔ قرب و جوار کے تین چار شہر دیکھے۔ اولڈھم' بری' بولٹن اور مانچسٹر وغیرہ۔ ہر سفر اور ہر شہر اس کے لیے ایک سنسنی خیز تجربہ تھا۔ اسے تو یہ معلوم تھا کہ برطانیہ کے اکثر صنعتی شہروں میں ایشین تارکینِ وطن کی تعداد خاصی ہے۔ تاہم یہ گمان تک نہ تھا کہ بعض علاقوں میں وہ اتنی بڑی تعداد میں نظر آئیں گے کہ ان کے علاقے میں گھومتے پھرتے شک گزرے گا کہ وہ انگلینڈ میں نہیں' اپنے ملک کے کسی شہر میں گھوم رہا ہے۔ اس نے لوگ دیکھے' عورتیں' مرد' بچے۔ برصغیر کے تقریباً ہر خطے سے آئے ہوئے۔ لیکن اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ نئی اور پرانی نسل میں ایک واضح خطِ امتیاز موجود ہے۔ اس نے دیکھا کہ زیادہ عمر کے افراد اکثر داڑھی رکھتے ہیں اور سر پر کڑھی ہوئی ٹوپی۔ اور اپنے حلیے سے وہ ایشین ہی نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں اسے اِکا دُکا خواتین برقع میں بھی نظر آئیں۔ لیکن نئی نسل کا معاملہ برعکس تھا۔ برطانیہ میں پلے بڑھے لڑکے لڑکیاں اپنی رنگت اور خدوخال کی بنا پر تو ایشین لگتے' تاہم ان کا مزاج' رویہ اور سوچ صاف اعلان کرتے کہ وہ مغربی زیادہ ہیں۔ اپنے باپ دادا کے تہذیبی اور تمدنی پس منظر سے ان کا ذہنی رشتہ برائے نام ہے۔ نئی نسل کے لڑکے لڑکیاں جدید فیشن کے کپڑے پہنے ہوئے نظر آئے۔ بالوں کی آرائش بھی انگریز لڑکیوں جیسی ہوتی.... لپ اسٹک اور مسکارا اور نہ جانے کیا کیا۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا کہ فیشن کی ہوا اس کے اپنے ملک میں بھی خوب دھوم دھام سے چل رہی تھی۔ لیکن جب اس نے اکثر ایشین لڑکیوں کو بالشت بھر کے اسکرٹ اور کھلے گلے کے ذرا سے بلاؤز میں دیکھا تو اسے تعجب ہوا۔ ایک اور لباس بھی اسے بڑا مضحکہ خیز لگا۔ یہ ایک دھوتی نما کپڑا تھا جسے لڑکیاں بلاؤز کے ساتھ زیریں جامے کے طور پر پہنتی تھیں۔ پتا نہیں اس لباس کا نام کیا تھا۔ یہ تو اسے نہیں معلوم تھا مگر یہ ضرور ہے کہ اس نے جب بھی کسی لڑکی کو اس لباس میں دیکھا تو آپ سے آپ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔ کیونکہ اس لباس میں وہ لڑکیاں اچھی خاصی مسخری نظر آتی تھیں۔ مزید مشاہدہ یہ ہوا کہ پرانی نسل کے لوگ تو بے شک اردو یا اپنی مادری زبان میں بات کرتے ہیں' جبکہ نئی پود کی اکثریت صرف انگریزی میں اناپ شناپ کرنا پسند کرتی ہے۔ آتے جاتے اکثر اس نے یہ منظر بھی دیکھا کہ بس اسٹینڈ کے شیڈ میں' کسی دکان کے سائبان کے نیچے یا کسی بینچ پر ایک ایشین لڑکی اور ایک لڑکا ایک دوسرے میں سمائے ہوئے ہیں۔ جسم سے جسم' ہونٹ سے ہونٹ۔ لڑکے کے لیے ایشین ہونا ضروری نہیں' وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ ایشین' انگریز' اسکاٹش' حتیٰ کہ افریقی بھی۔ اسی طرح ایشین لڑکوں کے ساتھ انگریز لڑکیاں نظر آتیں۔ چھیڑ چھاڑ اور دست درازی میں مصروف۔ چرس کے نشے میں سرشار۔

لیکن ہر منظر آنکھوں کے لیے اچنبھے کا باعث نہیں تھا۔ اس نے ایسا بھی بہت کچھ دیکھا جو اسے اچھا لگا۔ اس نے ایسی لڑکیاں دیکھیں جو صرف ایشیائی لباس پہنتی تھیں پورا حجاب باندھتی تھیں اور نظر جھکا کر چلتی تھیں۔ وہ لڑکیاں اسے بہت اچھی لگیں۔ دل و نگاہ کو راحت اور مسرت عطا کرنے والی' جیسے دلکش پریاں ہوں اور کسی دوسرے جہاں سے اتر کر آئی ہوں۔ پھر اس نے چھوٹے چھوٹے بچے دیکھے۔ سر پر ننھی سی ٹوپی سجائے' ہاتھ میں سپارہ تھامے' شام کے ریشمی دھندلکے میں مسجد کی اور چلے جارہے ہیں۔ وہ بچے اسے بہت اچھے لگے۔ تقریباً ہر شہر میں اسے مسجدیں نظر آئیں۔ جدید وضع کی خوب صورت مسجدیں' مانچسٹر کی ایک خوب صورت مسجد کو دیکھ کر اس نے تعجب اور مسرت کا اظہار کیا تو بشیر احمد نے کہا۔

"کبھی موقع ملے تو بلیک برن جانا۔"

"بلیک برن؟" اس نے تعجب سے پوچھا "یہ کہاں ہے؟"

"مانچسٹر سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔" بشیر احمد بتانے لگے "بلیک برن کو چھوٹا سا شہر ہے اور وہاں دیکھنے کے قابل کچھ بھی نہیں ہے لیکن مسجدیں ہیں۔ پورے یورپ میں بلیک برن غالباً واحد شہر ہے جہاں مسجدوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ مانچسٹر میں بھی اتنی مسجدیں نہیں ہیں۔"

"اچھا!"

"ہاں اور کچھ مسجدیں تو نہایت عالی شان ہیں۔ دیکھ کر جی خوش ہوجاتا ہے۔"

"موقع ملا تو ضرور جاؤں گا۔" اس نے کہا۔

کبھی کبھی اسے ایک اچنبھا گھیر لیتا۔ اسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی۔ ایسا لگتا کہ وہ محض ایک تماشائی ہے۔ نادیدہ' وہ موجود ہے'

پر نہیں ہے۔ وہ انگلستان کے شہروں میں مارا مارا پھر رہا ہے' سڑکوں پر چل رہا ہے اور ایک خاموش تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ پھر بھی قانونی طور پر اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ کسی ڈاکٹر کے پاس' انکم ٹیکس میں' سوشل سیکیورٹی میں' محکمۂ پیدائش و اموات کے دفتر میں' کسی جگہ اس کے فارم کا اندراج نہیں ہے۔ گویا وہ انگلستان میں موجود نہیں ہے۔ پھر بھی موجود ہے۔ یہ عجیب مضحکہ خیز مگر خوف زدہ کرنے والی صورتِ حال ہے۔ اگر کل کلاں اسے اپنا وجود ثابت کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو وہ کیا کرے گا۔ کیسے ثابت کرے گا کہ وہ بھی موجود ہے۔ مگر سردست اسے اس بات کی چنداں فکر نہیں تھی۔ اگر انگلستان میں اس کا ہونا قانون کی نظروں میں غیر مرئی ہے تو بھی وہ خوش ہے۔ اس کا ایک مقصد ہے' ایک مشن ہے.... فی الحال وہ اپنی تمام تر توجہ اور توانائی اس مقصد کے حصول پر مرکوز رکھنا چاہتا ہے۔ جب وقت آئے گا اور مناسب ہو گا تو وہ قانون کی نظروں میں اپنے وجود کو ثابت کرنے کے بارے میں بھی سوچے گا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ ان کے لیے بھی جو مرئی تھے اور ان کے لیے بھی جو غیر مرئی تھے۔ وقت کسی قانون کا پابند نہیں ہوتا اور اسے اپنا وجود ثابت کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ موجود ہے اور گزرتا رہتا ہے۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے چار ماہ گزر گئے۔ ان چار مہینوں میں چوہدری کرم داد کے مکان میں چند ایک تبدیلیاں ہوئیں۔ سلیم خاں کے اسائلم کے کیس کی پیشی ہوئی اور پھر تاریخ بڑھ گئی۔ سلیم خاں رحمت علی کے ساتھ عدالت میں گیا تھا۔ واپس آیا تو مٹھائی کے دو ڈبے لے کر آیا۔ کیونکہ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے سب کو مٹھائی کھلائی پھر کہنے لگا "ایک سال اور مل گیا ہے۔ یہ وقت بہت ہے۔ میں اس عرصے میں تین چار ہزار پاؤنڈ اور بنالوں گا۔ اس کے بعد اگر مقدمہ ہار بھی گیا تو کوئی بات نہیں۔ واپس چلا جاؤں گا۔" ایک تبدیلی یہ ہوئی کہ سلیمان اپنی دل آرام سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شادی کوئی دو ماہ قبل ہوئی تھی۔ لیکن کس دن ہوئی اور کہاں ہوئی' اس کا علم کسی کو نہیں تھا۔ سلیمان نے کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔ بس ایک دن اچانک اس نے اطلاع دی کہ شادی ہو گئی ہے۔ ثبوت کے لیے سرٹیفکیٹ بھی پیش کر دیا۔ مگر دور سے اس طرح دکھایا کہ کوئی اس کی بیوی کا نام نہ دیکھنے پائے۔

اس کی اس حرکت کا بعض افراد نے برا مانا مگر سلیمان نے پروا نہیں کی۔ کہنے لگا' ویزے کا مسئلہ حل ہو جائے پھر نام بھی بتا دے گا اور سب کی دعوت بھی کرے گا۔ پھر وہ اپنا سامان لے کر چلا گیا۔ نہ صرف گھر سے بلکہ شہر بھی چھوڑ دیا۔ کوئی ڈیڑھ ماہ بعد ایک شام ملاقات کے لیے آیا تو منکشف ہوا کہ اپنی بیوی کے ساتھ ویلز میں رہتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ویزے کے لیے قانونی کارروائی شروع ہو چکی ہے اور یہ کہ جلدی ہی مستقل قیام کی اجازت مل جائے گی۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کی بیوی کا کیا ردِ عمل تھا' جب اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ اس ملک میں شادی کر کے صرف ایک سال کے ویزے پر آیا تھا اور یہ کہ طلاق یافتہ ہے تو سلیمان پورے بتیس دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

"بھائی بڑی مصیبت ہو گئی تھی۔"

"اچھا' کیا ہوا تھا؟"

"ارے بھائی ہونا کیا تھا۔" سلیمان کہنے لگا "میرا تو ویزا ختم ہو رہا تھا۔ لہٰذا بتانا تو تھا ہی۔ لیکن جونہی میں نے زبان کھولی' قیامت آگئی۔ میری بیوی کا بھائی مجھے گولی مارنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کا ایک چچا ہے' اس نے فوری طور پر طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ خود میری بیوی بھی آگ بگولہ ہو رہی تھی لیکن اس کی ماں نے سمجھ داری سے کام لیا۔ اس نے کہا کہ لڑکی کو ایک بار طلاق ہو چکی ہے۔ اب دوسری بار طلاق دلوا کر تماشا نہ بناؤ۔ تب وہ لوگ ذرا ٹھنڈے پڑے۔"

"تو گویا اب سب ٹھیک ٹھاک ہے۔" رحمت علی نے کہا۔ "اب تمہیں ویزا مل جائے گا اور پھر غالباً تم اسے طلاق دے دو گے۔"

سلیمان چند لمحے چپ رہا۔ پھر طویل سانس لے کر بولا "یار مجھے لگتا ہے کہ یہ اتنا آسان نہیں ہو گا۔"

"کیوں؟"

"بات یہ ہے بھائی۔" سلیمان مدھم لہجے میں بولا "کہ ویزے کی کارروائی بیوی کی طرف سے ہوتی ہے۔ یعنی وہ اسپانسر کرتی ہے۔ میں نے تو اپنی بیوی سے کہا تھا کہ مستقل ویزے کے لیے درخواست دو۔ مگر اس نے اس موضوع پر کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ پھر مجھے کچھ ایسے اشارے ملے جن سے شک ہوتا ہے کہ وہ لوگ میرا صرف ایک سال کا ویزا بڑھوائیں گے۔ دراصل اس کا بھائی بہت چالاک ہے۔ یہ پٹی اسی نے پڑھائی ہے۔ جو وکیل کارروائی کر رہا ہے' میں اس کے پاس گیا تھا۔ مگر اس نے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔ اب کیا ہے کہ اگر بیوی نے واقعی صرف ایک سال کا ویزا بڑھوایا تو میں ذرا دیر تک پھنسا رہوں گا۔" سلیمان نے ٹھنڈی سانس لی۔

"یار میں سمجھا نہیں۔ ذرا وضاحت کرو۔" علی نے استفسار کیا۔

سلیمان نے ایک اور سانس لی "یار اس کا بھائی اصل میں بہت چلتا پرزہ ہے۔ غالباً اسے شک ہے کہ میں ویزا بڑھنے کے بعد دھوکا دوں گا اس لیے وہ صرف ایک سال کا ویزا بڑھوائے گا تاکہ میں کوئی قدم نہ اٹھا سکوں۔ ایک سال کا ویزا بڑھوانا ضابطے کے خلاف نہیں ہے۔ اگرچہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔"

"تو گویا تم اپنی چال چل رہے ہو اور وہ لوگ اپنی۔" شاہ نواز نے ہنس کر اظہارِ خیال کیا۔

"لگتا تو یار ایسا ہی ہے۔" منظور احمد بیدل نے تبصرہ کیا "اب دیکھنا یہ ہے کہ بات کیسے ہوتی ہے۔"

سلیمان ہولے سے ہنسا مگر چپ رہا۔ چند لمحے بعد شاہ نواز نے کہا "بات تو خیر انہی لوگوں کو ہوگی۔ بس یہ ہے کہ سلیمان کو کچھ اور انتظار کرنا پڑے گا۔ کیوں سلیمان؟"

سلیمان نے سگریٹ جلائی پھر کہنے لگا "ہاں خیر یہ تو ہے۔ مگر ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ صرف شک ہے کہ وہ لوگ شاید ایک سال کا ویزا بڑھوائیں گے۔ ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ بہرحال' دیکھا جائے گا۔"

جب سلیمان نے شادی کی تھی اور گھر چھوڑا تھا اس کے دو تین ہفتے بعد چوہدری کرم داد اچانک ملک چلا گیا اور کوئی تین ہفتے بعد واپس آیا۔ تب ایک حیرت ناک انکشاف ہوا۔ جس نے سنا' دانتوں تلے انگلی داب کر رہ گیا۔ بلکہ بشیر احمد' صدیق اور علی وغیرہ کو تو یقین کرنے میں تامل ہوا۔ انکشاف یہ ہوا کہ پیچھے وطن میں چوہدری کرم داد نے ایک عدد شادی کر رکھی تھی۔ معلوم ہوا کہ کوئی سال سوا سال قبل وہ وطن گیا تھا اور خفیہ طور پر شادی کرلی تھی۔ اس کے بھائی اور بیٹوں وغیرہ کو بھی اس کی اطلاع نہیں تھی۔ پھر چند ماہ بعد اس نے چپکے چپکے بیوی کے ویزے کی کارروائی شروع کردی تھی۔ اس بار وطن جانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ اپنی نئی نویلی بیوی کو انگلینڈ لاسکے کیونکہ ویزا لگ گیا تھا۔ چنانچہ وہ گیا اور اپنی بیوی کو لے کر واپس آیا۔ اس کی بیوی کو دیکھ کر ایک بار پھر سب کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ کیونکہ وہ عمر میں چوہدری کرم داد کے بڑے بیٹے کے برابر ہی تھی۔ ممکن ہے' دو ایک سال بڑی رہی ہو۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ قد درمیانہ اور جسم چھریرا۔ اس کی آنکھیں گو خوب صورت تھیں مگر ان میں ایک عجیب سی اداسی اور خوف کا عنصر گھلا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک ہاری اور ٹوٹی ہوئی عورت ہے۔ اور اپنے آپ سے' اپنے گردوپیش سے خوف زدہ ہے۔ جیسے اسے بھروسا نہیں ہے۔ نہ اپنے آپ پر' نہ اپنے گردوپیش پر۔ مجموعی طور پر وہ ایک ایسی ہرنی کی طرح نظر آئی جو اپنی ماں سے بچھڑ گئی ہو۔ اور اب حیران اور سراسیمہ ہو کہ اپنی ماں کو تلاش کرے تو کیسے؟ اور اپنے گھر پہنچے تو کیسے؟ علی نے اس کی آنکھوں میں رچی ہوئی افسردگی اور ہونٹوں پر پھیلی ہوئی' مسرت سے محروم' مسکراہٹ دیکھی اور اپنے سینے میں کسی شے کو ٹوٹتے ہوئے محسوس کیا۔

دو تین دن میں چوہدری کرم داد کی نئی بیوی کا پورا پس منظر بشیر احمد' صدیق اور علی وغیرہ کے علم میں آگیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا نام ہاجرہ ہے۔ اس کے ماں باپ بے حد غریب ہیں۔ اس کی پہلی شادی ناکام ہوگئی تھی اور ناکامی کا سبب یہ تھا کہ اس کے ماں باپ نے اسے دو چار جوڑوں اور چار چھ برتنوں کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ اس کا شوہر شراب پی کر آتا تو اکثر اسے مارتا پیٹتا اور طعنے دیتا تھا۔ پھر جب اس کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تو ایک دن اس نے تین بار زبان ہلا دی۔ ہاجرہ میکے آکر بیٹھ گئی۔ اب روکھی سوکھی روٹی تھی اور بے بسی اور نامرادی سے بھرے ہوئے لمبے لمبے دن۔ ہاجرہ نے طے کر رکھا تھا کہ وہ دوسری شادی کبھی نہیں کرے گی۔ بلکہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی دیکھ بھال اور خدمت میں ساری عمر گزار دے گی۔ لیکن اسے علم نہیں تھا کہ فیصلے کا اختیار وقت نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ نیز یہ کہ اس کی قسمت وقت کے آگے سر جھکانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی۔ اس کی تین بہنیں تھیں۔ ان میں سے ایک کی شادی طے ہوچکی تھی مگر ہو نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کے باپ کے پاس اپنی بیٹی کو دینے کے لیے ایک بار پھر دو چار جوڑوں اور چار چھ برتنوں سے زیادہ کچھ نہیں تھا اور وہ حیران تھا کہ کیا کرے' کیسے اپنی لختِ جگر کا گھر بسائے۔ مجبوری.... مجبوری.... وہ اِدھر اُدھر بھاگا بھاگا پھرا۔ کہیں سے کسی طرح کچھ قرض مل جائے۔ لیکن قرض بھی نہیں ملا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی ہزاروں کا مقروض تھا۔ پھر انہی دنوں چوہدری کرم داد اپنی تجوری جیسی توند کے ساتھ وطن پہنچا۔ یہ کوئی سال سوا سال قبل کی بات ہے۔ چوہدری کرم داد کی کچھ واقفیت ہاجرہ کے باپ چراغ دین سے تھی۔ وہ چراغ دین کے گھر گیا تو اس کی پریشانی اور اس کی مجبوری اس کے علم میں آئی۔ چوہدری کرم داد نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اپنی تجوری جیسی توند پر ہاتھ پھیرا۔ نظر بھر کر ہاجرہ کے جوان چھریرے جسم کو دیکھا پھر چراغ دین کی مدد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

فیصلے کا اختیار نہ چراغ دین کو تھا اور نہ ہاجرہ کو۔ یہ اختیار تو وقت نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ چراغ دین اور ہاجرہ کے بس میں تو صرف اتنا تھا کہ فیصلہ مانیں یا انکار کردیں۔ لیکن اگر انکار کرتے تو کہاں جاتے۔ بیٹیوں کا کیا ہوتا۔ قرضہ کیسے ادا ہوتا۔ ہاجرہ کو یہ بھی یاد آیا کہ اس نے تو اپنی زندگی والدین اور بھائی بہنوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کردی ہے۔ اور ان کی فلاح کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنا آپ قربان کردے۔ چنانچہ اس نے ہاں کردی۔

چوہدری کرم داد نے ہاجرہ کی بہن کی شادی کروائی۔ چراغ دین کا قرض ادا کیا۔ کچھ رقم نقد دی اور آئندہ بھی مدد کرتے رہنے کا وعدہ کیا۔ پھر ایک دن خفیہ طور پر اس نے ہاجرہ سے نکاح پڑھوالیا۔

یہ ساری معلومات حاصل ہوئیں تو بشیر احمد نے تلخی سے کہا۔ "لعنت ہے۔"

صدیق نے سرہلایا "گویا خرید و فروخت آج بھی ہوتی ہے۔"

اس وقت وہ بشیر احمد کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کچھ ہی دیر پہلے چوہدری کرم داد سے مل کر اور ہاجرہ سے دو ایک باتیں کرکے آئے تھے۔ علی بھی ساتھ میں تھا۔ شام کا ویران دھندلکا کفن کی طرح فضا پر پھیلا ہوا تھا۔ علی نے خالی خالی نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پھر کہنے لگا "آپ ٹھیک کہتے ہیں صدیق بھائی' خرید و فروخت آج بھی جاری ہے۔ اگر آپ چوہدری کرم داد سے بات کریں تو وہ اپنے

اس عمل کو مدد کا نام دے گا۔ وہ کہے گا کہ اس نے ایک غریب اور مجبور آدمی کی مدد کی ہے۔ ایک طلاق یافتہ عورت کو سہارا دیا ہے۔ لیکن عملاً یہ خرید و فروخت ہی ہے۔ اس نے مدد کی آڑ میں مجبور آدمی سے اس کی بیٹی کا جسم خریدا ہے۔ ستم یہ ہے کہ تیسری دنیا میں یہ خرید و فروخت آج بھی چل رہی ہے۔ مگر ہم میں سے کسی کو شرم تک نہیں آتی۔"

"تاہم سوال یہ ہے کہ چراغ دین نے اپنی بیٹی کو بیچ کیسے دیا؟" صدیق نے کہا۔

"مجھے تو بے چاری لڑکی پر ترس آتا ہے۔" بشیر احمد نے طویل سانس لی اور کپ اٹھا کر چائے کا گھونٹ بھرا۔

"مجبوری بری بلا ہے۔" صدیق نے مزید تبصرہ کیا۔

"ٹھیک کہتے ہو صدیق بھائی تم۔" بشیر احمد نے سرہلایا "آدمی جب مجبور ہو اور اس کے پاس کوئی راستہ نہ ہو تو وہ ہر قدم اٹھانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی آدمیت بیچتا ہے۔ دولت اور اختیار والوں کے آگے سر جھکاتا ہے۔ انہیں مائی باپ' سرکار اور حضور کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ ان کے پاؤں چھوتا ہے۔ اور..." بشیر احمد نے رک کر زور سے سانس لی "اور حتیٰ کہ اپنی اولاد تک بیچ دیتا ہے۔"

صدیق نے قدرے توقف کیا پھر بولا "آپ نے دیکھا تھا' کیسی معصوم سی ہے۔ مگر یوں سہمی ہوئی جیسے اسے معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے اور اسے کہاں جانا ہے۔ اب بے چاری ساری زندگی یونہی گزارے گی کہ نہ اسے اپنی ذات کا اعتبار ہو گا اور نہ اپنے کل کا۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"خیر افسوس کی بات تو ہے۔" علی نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھا "مگر اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ آپ یہ دیکھیے کہ اس نے چوہدری کرم داد جیسے بوڑھے' کنجوس اور خود پرست آدمی کے ساتھ زندگی گزارنا صرف اس لیے پسند کیا ہے تاکہ وہ اپنے باپ کے سر سے مسائل و مصائب کا بوجھ اتار سکے اور اپنی بہنوں کو آباد کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں اس نے خود کو بیچ کر ان کے لیے سکون اور خوشی کے چند لمحے خریدے ہیں اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ کتنے لوگ ایسی قربانی دیتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں' یہ خود غرضی' افراتفری' لوٹ کھسوٹ اور نمائش کا زمانہ ہے۔ ہم سب چمکتی ہوئی چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ خاص طور پر اپنے وطن میں تو عجیب حال ہے۔ آدمی خود اپنے لیے ایک بددعا بنتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں اگر ایک عورت اتنی بڑی قربانی دے تو کیا یہ قابلِ تحسین بات نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو میاں۔" بشیر احمد نے طویل سانس لے کر کہا "خدا کرے وہ لڑکی اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔"

چوہدری کرم داد نے دو ہفتے اپنی بیوی کو اس مکان میں رکھا۔ اس دوران میں وہ دوبار برمنگھم گیا۔ ایک بار ہاجرہ کو بھی لے گیا۔ پھر ایک بار اس کا بھائی چوہدری فضل داد اور اس کا لڑکا راچڈیل آئے۔ دراصل چوہدری کرم داد کی شادی سے وہ لوگ خوش نہیں تھے مگر کئی ملاقاتوں اور خاصی تلخ اور تیز و تند بحث و تمحیص کے بعد انہوں نے ہاجرہ کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ پھر چوہدری کرم داد نے راچڈیل کی رہائش ترک کر دی اور اپنی بیوی کو لے کر برمنگھم چلا گیا۔ گھر کی دیکھ بھال اور کرایہ وغیرہ وصول کرنے کی ذمے داری اس نے بشیر احمد کے سپرد کر دی۔

پھر ایک دن قربان بھی چلا گیا۔ نیا پاسپورٹ بنوانے کی اس کی کوششیں ابھی ابتدائی مرحلے میں تھیں۔ کامیابی کی خاصی امید تھی اور اس کا ارادہ چوہدری کرم داد کا مکان چھوڑ کر جانے کا نہیں تھا۔ مگر غالباً اسے کچھ ایسی اطلاع ملی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ پولیس کو اس کے راچڈیل میں موجود ہونے کی سن گن کہیں سے مل گئی ہے اور اس بات کا خدشہ ہے کہ ممکن ہے' وہ لوگ کسی بھی وقت گھر پر آجائیں۔ اس نے علی اور راجا وغیرہ سے کہا کہ وہ اگر چوہدری کرم داد کے مکان میں رہا اور پولیس کسی وقت آگئی تو ممکن ہے' دوسرے لوگ بھی مشکل میں پڑ جائیں اور چونکہ وہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کی وجہ سے کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچے' لہٰذا اس کا چلا جانا ہی مناسب ہو گا۔

"اور وہ تمہارے پاسپورٹ کا کیا ہو گا؟" علی نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

"میں اس آدمی سے رابطہ رکھوں گا۔" قربان نے جواب دیا۔ "اور اگر کامیابی ہوئی تو میں تمہیں ضرور اطلاع دوں گا۔ اطمینان رکھو۔"

"جاؤ گے کہاں؟" یہ سوال راجا نے کیا۔

"ابھی کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" قربان نے سوچتے ہوئے کہا "میرے گاؤں کا ایک آدمی چارلے میں رہتا ہے۔ سردست تو وہاں جاؤں گا۔ مگر ہو سکتا ہے کہ وہاں نہ رکوں اور ہالی فیکس چلا جاؤں۔ کیونکہ وہاں بھی میرا ایک واقف ہے۔ مگر تم مطمئن رہو' میں تمہیں اپنے نئے ٹھکانے سے مطلع ضرور کروں گا۔"

قربان کے جانے کے بعد چوہدری کرم داد کے مکان کی آبادی گھٹ کر آٹھ رہ گئی تھی۔ پھر سات ہو گئی۔ کیونکہ پھر ایک دن نواز شاہ بھی چلا گیا۔ وہ بھی غیر قانونی تھا اور قانون سے بچنے پر مجبور تھا۔ مگر اس کے جانے کا سبب یہ نہیں تھا کہ اسے پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ بلکہ وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی ملازمت سے تنگ آگیا تھا۔ جس جگہ وہ کام کرتا تھا وہاں کام کے اوقات طویل تھے۔ محنت بھی بہت زیادہ تھی۔ مگر اجرت کی شرح حسبِ معمول اچھی نہیں تھی۔ صرف ایک پاؤنڈ پچاس پنس فی گھنٹا۔ نواز شاہ گزشتہ کچھ دنوں سے دوسری ملازمت کے چکر میں تھا۔ مانچسٹر کے قریب ایک چھوٹے سے ٹاؤن میں جس کا نام ہائیڈ ہے' اسے ایک واقف کار کی مدد سے ایک نسبتاً

بہتر ملازمت مل گئی تھی۔ مشاہرہ دو پاؤنڈ پچاس پنس فی گھنٹا۔ چنانچہ ایک دن نواز شاہ نے بھی اپنا بیگ اٹھایا اور پھر ملتے رہنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔

اب مکان میں صرف سات افراد تھے۔ چوہدری کرم داد نے بشیر احمد کو تاکید کی تھی کہ کوئی نیا کرائے دار آئے تو فوراً رکھ لینا۔ لیکن کوئی نیا لاجر نہیں آیا اور مکان کی آبادی سات افراد پر ہی مشتمل رہی۔ سات افراد کو اتنے کم نہیں پھر بھی مکان میں خاموشی اور سناٹا زیادہ بڑھ گیا تھا۔ بشیر احمد اور صدیق عموماً اپنے کمروں تک محدود رہتے تھے۔ باہر نکلتے بھی تو نچلی منزل کا لونگ روم استعمال کرتے۔ اوپر دوسری منزل کی لینڈنگ کا عارضی "سٹنگ روم" ویران پڑا رہتا۔ کبھی کبھی منظور احمد بیدل قالین پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا نظر آتا۔ ہاتھ میں رائٹنگ پیڈ اور بال پوائنٹ' وہ بدستور ایک ایسا ناول لکھنے کی کوشش میں مصروف تھا جو "وار اینڈ پیس" اور "ڈاکٹر ژواگو" سے بھی زیادہ معرکہ آرا ہوگا اور اسے ساری دنیا میں مشہور کردے گا۔ حالانکہ اس نے یہ دونوں ناول پڑھے ہی نہیں تھے' صرف ان کے نام سنے تھے۔ سلیم خاں ان دنوں گھر سے کچھ زیادہ ہی غائب رہتا تھا۔ کام ختم کرتا تو ایمی کے پاس چلا جاتا۔ ایمی سے اس کی دوستی کچھ ہی دن قبل ہوئی تھی اور بقول اس کے وہ ایمی کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس نے یہ اشارہ بھی دیا تھا کہ اگر بات بن گئی تو ایمی سے شادی کرلے گا۔ ایمی کا اصل نام امینہ شیخ تھا۔ وہ مخلوط النسل تھی۔ ماں یوگنڈا کی تھی' باپ ایشیائی۔ لیکن باپ کا انتقال ہوچکا تھا۔ ماں زندہ تھی اور راچڈیل کی سوشل سروس میں کام کرتی تھی۔ امینہ خود بھی ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں ملازم تھی۔ سلیم خاں کی ملاقات امینہ سے کب' کہاں اور کیسے ہوئی تھی' یہ تو کسی کو علم نہیں تھا۔ البتہ ایک بار وہ امینہ کو گھر لے کر آیا تھا تاکہ اپنے "دوستوں" سے ملا سکے۔ علی نے امینہ کو دیکھا تو اس کے دل میں چنبیلی کی مہکتی ہوئی کلیاں کھلتی چلی گئیں۔

علی نے بہت سی دلکش اور جاذبِ نظر عورتیں دیکھی تھیں لیکن امینہ کا انداز سب سے الگ تھا۔ اس کا رنگ گو قدرے گہرا سانولا تھا لیکن اس میں ایک عجیب سی ملاحت اور صباحت تھی جو آنکھوں کو بہت بھلی لگتی تھی۔ ناک نقشہ تیکھا اور تراشیدہ' آنکھیں بڑی بڑی اور دمکتی ہوئیں۔ بال گھنگھریالے تھے اور ان میں سیاہ ریشم جیسی چمک تھی۔ دانت دودھ کی طرح سفید اور روشن۔ اس کا سراپا پرکشش اور جاذبِ نظر تو تھا ہی مگر اس کی مسکراہٹ اور بھی زیادہ دلکش تھی۔ وہ جب مسکراتی اور اس کے دانت دمکتے تو یوں لگتا' جیسے بجلی کوند گئی ہو۔ اس نے ٹخنوں تک لمبا فراک پہن رکھا تھا۔ فراک کے اوپر ایک لمبا سوئٹر تھا۔ سر پر ایک بڑا رومال اس طرح باندھا تھا کہ نصف پیشانی گردن اور شانے چھپ گئے تھے۔ چونکہ اس کا باپ ایشین تھا' اس لیے وہ اردو میں اچھی خاصی شدبد رکھتی تھی۔ جتنی دیر وہ بیٹھی' افریقی لہجے میں اردو بولتی رہی۔ علی دل ہی دل میں مسرور بھی ہوتا رہا اور حیران بھی۔ حیران یوں کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کی شخصیت دوسروں کو انجانے میں مسرت بھی عطا کرتی ہے اور خوب صورت جذبوں کا اعتبار بھی۔ امینہ ایسے افراد میں سے ایک تھی۔

پھر وہ چلی گئی۔

علی کو شک تھا کہ شاید سلیم خاں بھی وہی چال چل رہا ہے جو سلیمان نے چلی تھی۔ اس نے امینہ سے محض اس لیے تعلقات بڑھائے ہیں تاکہ اسے اپنے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرسکے۔ اسے تقریباً یقین تھا کہ سلیم امینہ سے شادی ضرور کرے گا اور پھر برطانیہ میں مستقل طور پر رہنے کا حق حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جب یہ بات اس نے سلیم خاں سے کہی تو اس نے اعتراف کرلیا کہ واقعی امینہ کو اس حد تک پسند کرتا ہے کہ اس سے شادی کرسکتا ہے۔

"تو کیا تم نے اس سے کوئی گفتگو کی ہے؟"

"ابھی تک تو نہیں۔" سلیم خاں کہنے لگا "دراصل میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو کچھ اور جان لیں۔ پھر اگر مناسب ہوا تو اس سے کہوں گا۔"

"تمہارے مقدمے کی اگلی سماعت غالباً آٹھ دس ماہ بعد ہوگی؟" علی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"ہاں' مگر کیوں؟" سلیم خاں نے تعجب سے کہا۔ پھر چونک کر بولا "آہا' میں سمجھ گیا تمہارا کیا مطلب ہے۔ نہیں' علی بھائی' ایسا مت سوچو۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اسائلم پر ہوں اور اس ملک میں رہنا چاہتا ہوں۔ اور میں کوئی بہت نیک آدمی بھی نہیں ہوں۔ اپنے مقصد کے لیے میں بھی شاید کسی کو دھوکا دے سکتا ہوں' پھر بھی میں سلیمان نہیں ہوں۔ کم از کم امینہ کے ساتھ فریب نہیں کرسکتا۔ تم نے دیکھا تھا' وہ کتنی نیک اور خوش مزاج ہے۔ اس کا باپ میرے ہی ضلع کا رہنے والا تھا۔ اس صورت میں تم خود سوچو میں اسے کیوں کر دھوکا دے سکتا ہوں۔ نہیں' علی بھائی' اگر امینہ کا ہاتھ مجھے مل جائے تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ ایسی اچھی لڑکیاں تو قسمت سے کسی کو ملتی ہیں۔"

علی حیرت سے سلیم خاں کو دیکھتا رہا۔

قدرے توقف کے بعد سلیم خاں نے مزید کہا "میں اسائلم پر ہوں اور یہی میرے پس و پیش کا سبب ہے۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اور جب بھی میں اس سے شادی کی بات کروں گا تو یہ ضرور واضح کروں گا کہ اگر میں مقدمہ ہار گیا تو اسے میرے ساتھ میرے ملک چلنا ہوگا۔ اب اگر وہ اس شرط کو مان لیتی ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ....." سلیم خاں ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہوگیا۔

"تم نے اسے بتا دیا ہے؟" علی نے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔" سلیم خاں نے جواب دیا "میں نے کہا نا' میں اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔"

یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک شام علی نے فیکٹری سے کام ختم کیا۔ گھر آتے ہوئے راستے میں ایک گروسری شاپ سے سبزی خریدی اور گھر کی طرف چلنا شروع کیا۔ خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ فضا میں ہلکی سی گھمس اور گرمی تھی۔ شام کی مدھم روشنی دھیرے دھیرے معدوم ہو رہی تھی۔ درختوں سے جھڑے ہوئے زرد پتے چاروں اور بکھرے ہوئے تھے۔ سارے میں ایک ایسا بوجھل پن اور اداسی محیط تھی جو پت جھڑ کے موسم سے مخصوص ہے۔ علی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چلتا رہا۔ اس کے دل پر ایک بوجھ تھا' ایک بے کیفی اور درماندگی' جسے وہ خود نہیں سمجھ سکتا تھا۔ شاید موسم کا اثر تھا یا پھر تفکرات کا ردِ عمل۔ یہ بوجھ وہ کئی دن سے محسوس کر رہا تھا لیکن یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ تھک گیا ہے۔ بہت دیر سے چل رہا ہے۔ مسلسل اور رکے بغیر' اور اب تھک گیا ہے' آرام کرنا چاہتا ہے۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ یہ آرام کی خواہش کیوں؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس کے اندر شکست کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ بڑی اذیت ناک بات ہوگی۔ وہ تھک نہیں سکتا' وہ ہار نہیں مان سکتا۔ یہ اس کے اختیار کی بات نہیں۔ اسے چلتے رہنا ہے' مسلسل' رکے بغیر اور تھکے بغیر۔ ابھی تو منزل بہت دور ہے۔ اور جب تک وہ منزل پر نہ پہنچ جائے تب تک دم لینے کے لیے بھی نہیں رک سکتا۔

گھر پہنچا تو سناٹے نے استقبال کیا۔ بشیر احمد اور صدیق غالباً کام پر تھے۔ سلیم خاں بھی غائب تھا۔ اس نے بوجھل قدموں سے سیڑھیاں طے کیں اور تیسری منزل پر اپنے کمرے میں پہنچا لیکن اندر قدم رکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ راجا اپنے بیڈ پر گردن تک لحاف اوڑھے اور آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ یہ بات خلافِ معمول تھی۔ راجا سے ہفتے میں صرف ایک بار یعنی اتوار کی صبح ملاقات ہوتی تھی۔ تو پھر اس وقت وہ اپنے کمرے میں کیوں تھا۔ اسے تو کام پر ہونا چاہیے تھا۔ وہ تشویش اور حیرت سے چند لمحے راجا کو دیکھتا رہا۔ پھر آگے بڑھا۔

"راجا۔"

راجا نے آنکھیں کھولیں اور اسے غور سے دیکھا "ارے علی۔۔۔ آگئے تم؟"

"ہاں' مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ تمہیں تو کام پر ہونا چاہیے تھا۔ خیریت تو ہے؟"

راجا پژمردگی سے مسکرایا' پھر نحیف آواز میں بولا "کام پر تو گیا تھا۔ مگر طبیعت کچھ سست ہو گئی تو چلا آیا۔"

علی نے آگے بڑھ کر راجا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو ایک دم گھبرا گیا "ارے یار' تمہیں تو شدید بخار ہے۔"

"ہاں۔" راجا کی آواز سے نقاہت ٹپک رہی تھی "اچھا بھلا تھا۔ پتا نہیں کیسے بخار ہو گیا۔"

"کوئی دوا لی؟"

"نہیں۔"

راجا کو واقعی تیز بخار تھا۔ اس کا پورا جسم تپ رہا تھا۔ چہرہ بخار کی حدت کے باعث سرخ ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں میں زردی اتر آئی تھی۔ علی کو تشویش ہونے لگی' کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ وہ چند لمحے تفکر آمیز نظروں سے راجا کو دیکھتا رہا۔ پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "یار بخار تو بہت تیز ہے اور تم نے کوئی دوا بھی نہیں لی۔ میرا خیال ہے' ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"کون سے ڈاکٹر کو بلاؤ گے تم۔" معاً راجا نے طنزیہ آواز میں کہا "ہمارا تو کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔"

علی رک گیا۔ لمحہ بھر کو سوچتا رہا پھر بولا "میں منظور یا رحمت علی کے ڈاکٹر کو بلا لیتا ہوں۔"

"گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔" راجا نے مایوسی سے کہا۔ اور بے چینی سے سر کو جنبش دی "اور تمہیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم کسی ڈاکٹر کو بلا نہیں سکتے۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی میڈیکل کارڈ نہیں ہے۔"

علی رک گیا "ہاں یار یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم ڈاکٹر کو اپنے بارے میں کیا بتائیں گے۔" پھر چونک کر بولا "مگر یار راجا ایک بار قربان کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو بشیر صاحب نے ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ حالانکہ وہ بھی ہماری طرح غیر قانونی تھا۔"

راجا نے بے چینی سے سر ہلایا اور زور سے سانس لی "بشیر صاحب نے ڈاکٹر احمد کو بلایا تھا۔ ڈاکٹر احمد اچھے آدمی ہیں۔ وہ یہاں رہنے والوں کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں اور سب کی مدد کرتے ہیں۔ جبکہ کسی دوسرے ڈاکٹر پر بھروسا کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے' وہ انتظامیہ کو اطلاع دے دے۔"

"یار یہ تو واقعی بڑی مشکل ہے۔" علی نے بے بسی سے کہا "تو پھر کیا کریں۔ کیا میں ڈاکٹر احمد کے پاس جاؤں؟"

"کوئی فائدہ نہیں۔" راجا کی آواز سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔ "مجھے معلوم ہے' وہ چھٹی پر ہیں اور وطن گئے ہوئے ہیں۔" اس نے رک کر دھیرے دھیرے کئی سانسیں لیں۔ پھر نحیف آواز میں بولا "مگر تم گھبراؤ مت' مجھے ایک کپ چائے اور پیراسیٹا مول کی دو گولیاں دے دو۔ بخار انشاء اللہ کم ہو جائے گا۔ اگر صبح تک کچھ افاقہ نہ ہوا تو پھر بشیر صاحب سے کہیں گے۔ وہ ضرور کوئی صورت نکال لیں گے۔"

"اچھی بات ہے' میں چائے لاتا ہوں۔" علی نے کہا۔

کچھ دیر بعد علی چائے کے دو کپ' پانی اور دو گولیاں لے کر آیا۔ راجا نے گولیاں حلق سے اتاریں' پھر اوڑھ لپیٹ کر لیٹ گیا اور ہولے ہولے چسکیاں لینے لگا۔ علی کھڑکی کے پاس جا بیٹھا۔ کپ چوکھٹ پر رکھ دیا' ایک سگریٹ سلگالی اور افسردہ نظروں سے باہر دیکھنے لگا۔ اب روشنی دم توڑ چکی تھی اور اندھیرا آسمان سے اتر کر

دھرتی پر پھیلتا جارہا تھا۔ اور ایک بوجھل اداسی اور ویرانی۔ سامنے والے مکان کی دیوار پر ایک سیاہ بلی بیٹھی ہوئی تھی۔ علی اس بلی کو اکثر دیکھتا تھا۔ پتا نہیں کس کی بلی تھی اور کہاں رہتی تھی۔ علی اکثر دیکھتا تھا کہ وہ دائیں جانب سے آتی ہے اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بائیں طرف چلی جاتی ہے۔ اس نے کبھی بھی اسے بائیں جانب سے آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہمیشہ دائیں طرف سے آتی تھی اور بائیں طرف دیوار کے آخری سرے تک جاکر نیچے اتر جاتی تھی۔ علی خالی خالی نظروں سے بلی کو دیکھتا رہا۔ چند لمحے بعد بلی اٹھی' اس نے چاروں پاؤں پھیلا کر زور سے انگڑائی لی اور پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دیوار کے اختتام پر پہنچ کر نیچے اتر گئی۔ علی نے زور زور سے سانس لے کر ہونٹوں پر زبان پھیری۔

پھر اس نے گردن موڑ کر راجا کو دیکھا۔ بخار کی حدت سے راجا کا چہرہ بھبھرایا ہوا تھا۔ سانس بھی تیز چل رہی تھی۔ علی تشویش انگیز نظروں سے راجا کو دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں ایک بے بسی اور جھنجلاہٹ پھیلتی چلی گئی۔ کیسا عذاب ہے یہ' کیسی مصیبت اور لاچاری ہے۔ بیمار پڑجائیں تو ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جاسکتے۔ اگر بیماری شدید ہوجائے تو آدمی کیا کرے؟ اسپتال جانا ہو تو کیسے جائے۔ علی کو یاد آیا کہ گزشتہ دنوں ایسا ہی ایک واقعہ ہوا تھا۔ غالباً مانچسٹر میں۔ ایک آدمی شدید بیمار ہوگیا تھا۔ جب حالت زیادہ بگڑی اور کوئی چارہ نہ رہا تو ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے مریض کو فوری طور پر اسپتال بھیج دیا۔ ضروری کاغذات کی خانہ پری شروع ہوئی تو پتا چلا کہ مریض غیر قانونی امیگرنٹ ہے۔ اسپتال والوں نے فوراً پولیس کو اطلاع دے دی۔ بعد ازاں پولیس کی نگرانی میں اس کا علاج ہوا۔ صحت یاب ہوا تو عدالت میں پیش ہوا۔ مقدمہ چلا اور پھر واپس بھیج دیا گیا۔

یکایک علی نے کہا "یار راجا تمہاری طبیعت تو کافی خراب معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں یار بخار واقعی تیز ہے۔" راجا نے مدھم آواز میں کہا۔

"یار کہیں طبیعت زیادہ نہ بگڑ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ۔۔۔ ڈاکٹر احمد بھی نہیں ہیں۔"

راجا سمجھ گیا کہ علی کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھا پھر بولا "یار مجھے ایک سگریٹ سلگا کر دو اور تم بالکل فکر نہ کرو۔ انشاء اللہ ڈاکٹر یا اسپتال کی نوبت نہیں آئے گی۔ میں صبح تک ٹھیک ہوجاؤں گا۔ پھر بھی اگر ضرورت پڑی تو کسی کیمسٹ کو میرا حال بتا کر دوا لے آنا۔ لاؤ' ایک سگریٹ دو۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" علی نے کہا اور ایک سگریٹ سلگا کر راجا کو دی۔

کچھ دیر بعد علی نے پھر کہا "یار راجا ہم لوگوں کو یہاں آئے ہوئے سات آٹھ ماہ تو ہوگئے ہیں؟"

"ہاں' تو پھر؟" راجا نے حیرت سے پوچھا۔

علی کچھ دیر سوچتا رہا پھر سر ہلا کر بولا "یار پتا نہیں کیا بات ہے' مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ دل میں ایک خلش سی رہتی ہے۔ ایک الجھن۔ ایسا لگتا ہے جیسے کہیں کوئی بات غلط ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا بات ہے۔ بس ایک خوف سا رہتا ہے کہ کسی بھی وقت کوئی ناخوشگوار بات ہوجائے گی۔"

"میں سمجھ رہا ہوں' تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" راجا نے غور سے علی کو دیکھا۔

علی کھڑکی سے باہر ویران اور تاریک خلا میں گھورتا رہا اور آہستہ آہستہ کہتا رہا "دیکھو راجا' ہم لوگ کتنی محنت کرتے ہیں۔ بارہ بارہ گھنٹے کتوں کی طرح جٹے رہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا ایک مقصد ہے۔ ہم پائی پائی بچاتے ہیں۔ ڈبوں کی سبزیاں کھا کر گزارہ کرتے ہیں اور اگرچہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم یہاں کا قرضہ اتارنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ لیکن وہاں کا قرضہ تو ابھی باقی ہے۔ تو پھر حاصل کیا ہوا۔ ہم کب تک چوہوں کی طرح بلوں میں چھپتے پھریں گے۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔" وہ یکایک چپ ہوگیا۔

راجا چند لمحے ششدر اور خوف زدہ نظروں سے علی کو دیکھتا رہا پھر گھٹی ہوئی آواز میں بولا "یار ایسا تو نہ کہو۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔ اسی لیے تو یہ باتیں کررہا ہوں میں۔" علی نے زور سے سانس لی "دیکھو یار' یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ ہم بیمار ہوجائیں تو کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتے۔ سوشل سیکیورٹی میں کوئی کلیم نہیں کرسکتے۔ کام کرتے ہیں لیکن پوری اجرت کا مطالبہ نہیں کرسکتے۔ سات ماہ میں ہم نے کیا کمایا اور کیا بچایا ہے۔ کم از کم میری جیب تو خالی ہے۔"

راجا کچھ دیر چپ رہا اور سکتے کی سی کیفیت میں علی کو دیکھتا رہا۔ پھر پست آواز میں کہنے لگا "ہاں یار' یہ بات تو ہے۔ مجھے بھی اکثر ان باتوں کا خیال آتا ہے۔ اور تب دل میں بڑی مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ ہماری حالت تو کولھو کے اس بیل کی سی ہے جو ایک دائرے میں مسلسل چکر کاٹتا رہتا ہے۔ لیکن اسے خود معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیوں چکر کاٹ رہا ہے۔"

"لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہم کیا کماتے اور کیا بچاتے ہیں۔" علی نے گمبھیر لہجے میں کہا "بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کب تک ہم اس طرح رہیں گے۔ یقیناً یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ہم ہمیشہ اسی طرح چھپ چھپ کر رہیں۔ نوکری کرتے رہیں اور روپیہ گھر بھیجتے رہیں۔ یہ تو بڑی احمقانہ صورت ہے۔ کبھی تم نے اس پر غور کیا ہے۔"

"مشکل یہ ہے کہ ہم لوگ اسائلم کی درخواست بھی نہیں دے سکتے۔" راجا نے پژمردگی سے کہا۔

"ہاں۔" علی نے اتفاق کیا "ہمارے لیے وہ راستہ بھی بند ہے۔ کیونکہ سیاسی پناہ کے لیے قانونی طور پر یہاں آنا ضروری ہے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ ہم لوگ کیا کریں گے۔"

راجا نے سوالیہ نظروں سے علی کو دیکھا۔
علی نے مزید کہا "ایک بات اور بھی ہے۔ فرض کرو ہمیں کسی وجہ سے وطن جانا ہو تو کیا کریں گے۔ کیسے جائیں گے۔ قانونی طور پر تو سفر نہیں کر سکتے۔ تو پھر کیا جس طرح اسمگل ہو کر یہاں آئے تھے اسی طرح اسمگل ہو کر اپنے وطن جائیں گے۔"
راجا یکایک ہنسنے لگا "یار یہ تو بڑی مضحکہ خیز بات ہوگی۔"
علی بھی ہنسا "ہاں یار اچھا خاصا لطیفہ ہے۔ یعنی ہم کسی اسمگلنگ گروہ کو ڈھونڈیں اور ان سے کہیں کہ بھائی ہم اپنے گھر جانا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہمیں اسمگل کر سکتے ہو۔ کتنے پیسے لو گے؟"
راجا ایک بار پھر ہنسا "یار واقعی یہ بڑی عجیب و غریب صورتِ حال ہے۔ بالکل ایک بے تکا لطیفہ۔" پھر یکایک سنجیدہ ہو کر بولا۔ "ویسے بھائی علی یہ معاملہ واقعی اہم ہے۔ ہم لوگ یونہی تو نہیں رہ سکتے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ تم نے کچھ سوچا ہے' اس بارے میں۔"

"بہت سوچا ہے۔ کیونکہ ہماری حالت بہت غیر یقینی اور غیر محفوظ ہے۔ ہم ایک ایسی جگہ پر کھڑے ہیں جس کے چاروں طرف گہری دلدل ہے۔ ذرا سا چوکیں گے اور دلدل میں دھنس جائیں گے۔ لہٰذا کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ اگر ہمیں کسی طرح نیا پاسپورٹ مل جائے تو کچھ بات بن سکتی ہے۔"
"کیا نیا پاسپورٹ مل سکتا ہے؟" راجا نے چونک کر پوچھا۔
"پتا نہیں۔" علی تذبذب کے ساتھ بولا "میں نے دو ایک افراد سے بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پاسپورٹ مل تو سکتا ہے مگر آسان نہیں ہے۔ اگر سفارت خانے میں کوئی جان پہچان کا آدمی ہو تو شاید بات بن جائے۔"
"یار علی ایک آدمی ہے تو۔" معاً راجا نے کہا "میرے علاقے کا ہے۔ تھوڑی بہت واقفیت بھی ہے اس سے۔ میرا خیال ہے' کسی دن اس کے پاس چلیں۔ ممکن ہے وہ کوئی مدد کرے یا کوئی اور راستہ بتائے۔"
"کیا واقعی؟"
"ہاں۔" راجا نے جواب دیا "لیکن وہ کوئی مدد کرے گا یا نہیں' یہ تو تب ہی پتا چلے گا' جب اس سے بات کریں گے۔ ویسے مجھے تمہارے اس خیال سے پورا اتفاق ہے کہ اب مزید ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ آر یا پار۔ یار سچ پوچھو تو کبھی کبھی بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے' جیسے یہاں آکر سخت حماقت کی ہے۔ بقول بشیر صاحب کے روٹی تو وہاں بھی ملتی تھی تو پھر اس طرح یہاں آکر دوسروں کے ہاتھوں میں کھلونا بننے کی کیا ضرورت تھی۔ نہیں' یار اب کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔ اگر پاسپورٹ مل سکتا ہے تو لے لیتے ہیں۔ نیا پاسپورٹ لے کر ڈنمارک یا ناروے چلے جائیں گے۔ کیا خیال ہے۔"
"ناروے یا ڈنمارک.....؟"

"ہاں۔" راجا نے سر ہلایا "ڈنمارک میں میرے دو ایک واقف ہیں۔ اگر بات بن گئی تو وہیں رہ جائیں گے۔"
"خیال تو اچھا ہے۔" علی نے اتفاق کیا "مگر وہ بعد کی بات ہے۔ پہلے پاسپورٹ تو ملے۔"

○☆○

دو ہفتے کے بعد ایک دن راجا نے کام سے چار گھنٹے کی چھٹی کی۔ پھر دونوں اس آدمی کے پاس گئے جس سے راجا کی واقفیت تھی۔ وہ آدمی سفارت خانے میں غالباً ملازم تھا۔ راجا نے اسے ایک ریستوران میں نہ صرف چائے پلائی بلکہ سموسے اور سیخ کباب بھی کھلائے اور پھر پورا مسئلہ اس کے سامنے رکھا۔ تاہم یہ نہیں بتایا کہ وہ دونوں خود غیر قانونی ہیں۔ بلکہ اسے یہ تاثر دیا کہ ان کا ایک واقف غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہوا ہے اور اب اپنے قیام کو قانونی حیثیت دینا چاہتا ہے۔ اس آدمی نے سموسے کھائے' ڈکار لی' پھر اپنی موٹی موٹی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر ذرا تفصیل سے ایک تقریر جھاڑی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ بڑا مشکل اور پُرخطر کام ہے۔ پھر بھی کوشش کی جا سکتی ہے۔ شاید کامیابی ہو جائے۔ مگر وہ کوئی قطعی وعدہ کرنے سے قاصر ہے۔ پھر اس نے پورے طریقۂ کار کی وضاحت کی۔ کس طرح ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھانا ہوگا۔ کس طرح ضروری شرائط پوری کرنی ہوں گی۔ اس کے بعد بھی اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ پاسپورٹ بن ہی جائے گا۔
"مگر بھائی اس میں تو بڑا وقت لگے گا۔" راجا نے حیرت سے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے علی کی ڈبیا سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی "مگر بھائی کام کی نوعیت کو بھی تو دیکھو۔ اپنا ملک ہوتا تو چٹکی بجاتے کام ہو جاتا۔ مگر یہ انگلستان ہے۔ یہاں کی پولیس اور امیگریشن والے بڑے "ڈیل" ہیں۔ کسی کو نہیں چھوڑتے۔ لہٰذا بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ بہت احتیاط سے تاکہ کوئی خامی نہ رہ جائے۔"
"پیسے کتنے لگیں گے؟" علی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
اس آدمی نے رقم کا ذکر کیا تو راجا سٹ پٹا کر بولا "مگر بھائی یہ تو بڑی رقم ہے۔"
"سو تو ہے۔ اب ایسا کام کوئی دو چار سو پاؤنڈ میں تو نہیں ہو سکتا۔"
"کیا اور کوئی صورت نہیں ہے؟" علی نے پژمردگی سے پوچھا۔
"ایک صورت اور ہے۔" اس آدمی نے کہا "ایک آدمی ہے۔ وہ نیشنل انشورنس کارڈ بنوا سکتا ہے۔ ایک بار انشورنس نمبر مل جائے تو بڑی سہولت ہو جاتی ہے۔ پاسپورٹ بنوانے میں بھی زیادہ جھنجھٹ نہیں ہوتی۔ مگر اس میں بھی رقم اتنی ہی خرچ ہوگی۔ اب آپ لوگ سوچ لیں اور طے کر لیں کہ پاسپورٹ بنوانا ہے یا

انشورنس کارڈ لینا ہے۔ جب فیصلہ کرلیں تو آجائیں میرے پاس۔"

"اچھی بات ہے' ہم آپ کے پاس جلدی ہی آئیں گے۔" راجا نے پست آواز میں کہا۔

جب واپس روانہ ہوئے تو دونوں کے دل پر بوجھ تھا۔ چہرے بجھے ہوئے تھے اور اعصاب پر ایسی شکستگی اور مردنی چھائی ہوئی تھی جیسے دونوں بہت تھک گئے ہوں۔ اتنا کہ اب اور چلنے' ایک اور قدم اٹھانے کا یارا نہ رہا ہو۔ دونوں دراصل لاشعوری طور پر بڑی امید لے کر اس آدمی کے پاس گئے تھے۔ ان کے ذہن میں کامیابی کی آس اور یقین دونوں ہی موجود تھے۔ مگر اس کی باتیں سن کر وہ آس کچے دھاگے کی طرح ٹوٹتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ نہ صرف یہی کہ اس آدمی نے کامیابی کی قطعی ضمانت نہیں دی تھی بلکہ جو رقم بتائی تھی' وہ خاصی بڑی رقم تھی اور ان کے پاس نہیں تھی۔ آخر اتنی بڑی رقم وہ کہاں سے لائیں گے۔ اگر جمع کرنے کی کوشش کریں تو کافی وقت لگ جائے گا۔ دو یا تین سال۔ اتنا عرصہ اپنی ضرورتیں مار کر اور قانون کی نظروں سے چھپ کر گزارنا آسان تو نہیں ہوگا۔ تو پھر کیا کریں؟ کہاں سے اتنی رقم لائیں؟

بس کھلی سڑک پر دوڑتی رہی۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے باہر دیکھتے رہے۔ سبز پوش میدان' درختوں کے جھنڈ اور آسمان کے پیش منظر میں تیرتے ہوئے سیاہ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے۔ مگر ان کی آنکھوں کے سامنے نہ تو درخت تھے اور نہ سیاہ بادل۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تو مایوسی' بے کسی اور خوف کے غیر مرئی آسیب ناچ رہے تھے۔ سوالوں کی تیز اور زہریلی برچھیاں ہاتھوں میں تھامے ہوئے۔ کیا کریں گے وہ لوگ؟ کہاں جائیں گے؟ کیسے اتنی بڑی رقم اکٹھا کریں گے۔ بدشگونی کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ کب تک وہ خود کو بچا سکیں گے۔ وہ لوگ ایک ایسی بھول بھلیاں میں پھنس گئے ہیں جس سے باہر نکلنے کا راستہ شاید ہے ہی نہیں۔ یکایک علی کا دل گھبرا گیا۔ ایک وحشت سی اس پر طاری ہوگئی۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر یوں زور سے اور قدرے جارحانہ انداز میں کش لیا جیسے اپنا غصہ' پچھتاوا اور مایوسی سگریٹ پر اتار رہا ہو۔ پھر اس نے گردن گھمائی اور راجا کے کشیدہ چہرے کو دیکھا۔

"یار راجا۔"

"ہاں۔"

"کیا کریں گے یار اب؟"

"کیا بتاؤں بھائی۔" راجا نے ٹھنڈی سانس لی "میری عقل میں تو کچھ نہیں آتا۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے لائیں گے؟ مجھے تو آج کل بڑا ڈر لگتا ہے یار۔"

"ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے۔" علی نے ایک لیمپ پوسٹ پر بیٹھی ہوئی میک پائی کو دیکھا "لیکن ڈرنے سے تو کام نہیں چلے گا۔ کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ ورنہ یہ ذہنی عذاب ہم کب تک سہیں گے۔"

"کیوں نہ ہم لوگ بشیر صاحب اور منظور احمد بیدل سے بات کریں۔" یکایک راجا نے کہا۔

"بھلا وہ لوگ کیا کرسکتے ہیں؟" علی نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی وہ لوگ یہاں دیر سے ہیں۔ ان کے پاس یقیناً رقم ہوگی۔ اگر وہ دونوں ہمیں قرض دے دیں تو یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ ایک بار قانون کا خوف ختم ہوجائے تو ہم آزادی سے اپنی پسند کی ملازمت کرسکتے ہیں۔ آمدنی بھی دگنی سے زیادہ ہوجائے گی۔ پھر ہم بہ آسانی ان کا قرضہ اتار دیں گے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔" علی نے پُرخیال انداز میں کہا "لیکن رقم بڑی ہے۔ کیا وہ لوگ ہم دونوں پر اتنا بھروسا کریں گے؟"

"یہ تو ہے۔" راجا نے مایوسی سے کہا "پھر بھی بات کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"ہاں بات کرنے میں تو خیر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" علی نے اتفاق کیا۔

لیکن بشیر احمد اور منظور احمد بیدل سے بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

تیسرا دن تھا۔ علی معمول کے مطابق کام پر پہنچا۔ استری کرنے والا ایک آدمی چھٹی پر تھا۔ چنانچہ اسے آئرننگ پر لگا دیا گیا۔ عادت کے مطابق وہ انہماک سے ڈینم کی پتلونوں پر استری کرنے میں مصروف تھا۔ ایک کے بعد دوسری پتلون' پھر تیسری' پھر چوتھی۔ کمرے میں ٹیپ ریکارڈر کی مدھم آواز گونج رہی تھی۔ اے مرے دل کہیں اور چل' غم کی دنیا سے دل بھر گیا۔ مگر وہ جگہ کہاں ہے' جہاں غم نہ ہو۔ جہاں صرف خوشی ہو اور سکون ہو اور امن' اور جہاں آدمی زندگی کو زندگی کی طرح جی سکے۔ نہیں' ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس دنیا میں تو ہر طرف دکھ بھرے ہوئے ہیں' ہر جگہ محرومی ہے اور بے انصافی۔ اور نفرت اور تشدد۔ آدمی کو اگلی سانس کا بھروسا نہیں۔ تو پھر غم سے نجات ملے تو کیسے؟ علی نے زور سے سانس لی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اسی وقت کوئی زور سے چلّایا۔

"علی۔"

علی نے گردن گھمائی۔ دروازے میں مہربان کھڑا تھا اور ہاتھ سے صدر دروازے کی جانب اشارہ کررہا تھا۔ علی کی نظر خود بخود صدر دروازے تک گئی اور پھر اس کی رگوں میں خون جم گیا۔

صدر دروازے میں عبدل کھڑا تھا اور زور زور سے دونوں ہاتھ ہلا رہا تھا۔

مہربان نے یکایک زور سے کہا "بھاگو۔"

لیکن علی کا تو پورا جسم ہی ساکت ہوگیا تھا۔ پتھر کی طرح بے جان اور بھاری۔ وہ قدم اٹھاتا تو کیسے؟ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور ٹھہری ہوئی خوف زدہ آنکھیں عبدل پر جمی ہوئی تھیں۔ جو ہاتھ ہلا کر اسے بھاگنے کا اشارہ کررہا تھا۔ پھر جب مہربان نے دوسری بار تقریباً

چیخ کر "علی، بھاگو" کہا تو اس کا جسم یوں کانپا جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ اس نے پھرتی سے استری ٹیبل پر رکھی اور چھلانگ لگا کر دروازے کی طرف بھاگا۔ ٹوائلٹ سے ملحق عقبی سیڑھیاں تھیں۔ وہ اندھا دھند سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ دروازہ کھول کر گلی میں نکلا تو اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ سردی کے باوجود اس کی گردن اور پیشانی پسینے سے تر ہو گئی تھی اور سارا بدن یوں کانپ رہا تھا جیسے اس پر لرزہ چڑھ گیا ہو۔ خوف.... خوف.... ایک اعصاب کو توڑ ڈالنے والا خوف اس پر مسلط تھا۔ اور اس کے دل کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہا تھا۔ گلی میں وہ پل بھر کے لیے رکا اور وحشت بھری نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ عقبی گلی دور تک سنسان نظر آرہی تھی۔ اب کیا کروں، کدھر جاؤں۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر سوچا، پھر اسے عبدل کی ہدایت یاد آئی "گلی میں بائیں طرف بھاگو اور بس اسٹینڈ تک چلے جاؤ۔" چنانچہ اس نے قدم اٹھایا اور بائیں طرف بے تحاشا بھاگتا چلا گیا۔

لیکن اس نے بس نہیں پکڑی۔ ٹیکسی بھی نہیں کی۔ پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑا۔ اسے خود اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ دماغ میں خوف اور اضطراب براجمان تھا اور صرف ایک احساس کہ اسے اپنی جان بچانی ہے۔ فیکٹری میں چھاپا پڑ گیا ہے۔ اور اسے ان لوگوں کی دسترس سے دور جانا ہے۔ چنانچہ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ کبھی غیر ارادی طور پر دوڑنے بھی لگتا۔ کچھ دیر میں وہ ایک طویل چکر کاٹ کر چوراہے پر پہنچا اور پھر گھر کی جانب چل پڑا۔

گھر پہنچا تو بشیر احمد دروازے میں ہی مل گئے۔ وہ بہت گھبرائے نظر آرہے تھے۔ علی کو دیکھا تو گھبرا کر بولے "ارے علی، تم یہاں کیسے؟ میں تو تمہاری فیکٹری کی طرف آنے والا تھا۔"

علی سٹ پٹا گیا "میری فیکٹری کی طرف.... کیوں؟"

بشیر احمد کچھ کہتے کہتے معاً چپ ہو گئے۔ انہیں احساس ہوا کہ علی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ علی کی سانس پھول رہی ہے اور گردن پسینے سے تر ہے۔ انہوں نے یکایک متردد ہو کر کہا "کیا بات ہے علی، تم اتنے پریشان اور ہراساں کیوں نظر آرہے ہو۔ خیریت تو ہے؟"

"نہیں ہے۔" علی نے پست آواز میں کہا "چھاپا پڑ گیا ہے۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔"

"ارے تو تمہارے یہاں بھی چھاپا پڑ گیا ہے؟"

"ہاں، بس اچانک اور بغیر اطلاع کے وہ لوگ آگئے۔" علی نے سانسوں کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ پھر چونک کر بولا "یہ آپ نے بھی کا لفظ کیوں استعمال کیا۔"

"کیا بتاؤں میاں، بری خبر ہے۔" بشیر احمد نے ٹھنڈی سانس لے کر رنجیدہ آواز میں کہا "راجا کے یہاں بھی چھاپا پڑا ہے۔"

"ارے، راجا کے یہاں بھی چھاپا پڑا ہے۔" علی سٹ پٹا کر بولا۔ "یہ تو واقعی بری خبر ہے۔ راجا کہاں ہے؟"

"وہ پکڑا گیا۔"

بشیر احمد کی آواز مدھم تھی۔ پھر بھی علی کو یوں لگا جیسے اس کے کانوں میں کوئی آتش گیر مادہ پھٹا ہو۔ ایک تیز اور اعصاب شکن گونج اس کے دماغ کے دور دراز گوشوں تک چیختی چلی گئی۔ اس کی ٹانگیں زور سے کانپیں۔ اگر وہ عجلت سے دیوار کا سہارا نہ لیتا تو یقیناً گر پڑتا۔ دیوار کا سہارا لے کر وہ چند لمحے یوں کھڑا رہا جیسے اس کا دم نکل چکا ہو۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے بدن میں جنبش ہوئی۔ وہ وہیں زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور بے بسی سے بشیر احمد کو دیکھنے لگا۔

"علی کیا بات ہے، تم ٹھیک تو ہو؟" بشیر احمد نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تو راجا پکڑا گیا۔" علی نے یہ جملہ یوں کہا۔ جیسے خود اپنے آپ سے بات کر رہا ہو۔

"ہاں۔"

"اب کیا ہو گا؟" علی کی آواز بے حد ٹوٹی ہوئی تھی۔

بشیر احمد بھی وہیں زمین پر اس کے سامنے بیٹھ گئے "راجا کے ساتھ ایک آدمی کام کرتا ہے۔ وہ بھاگ کر یہاں اطلاع دینے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ لوگ راجا کو پولیس اسٹیشن لے گئے ہیں۔ وہاں وہ راجا سے مزید پوچھ گچھ کریں گے۔ خاص طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ راجا کے ساتھ اور کتنے افراد غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے تھے۔ کب ہوئے تھے اور اب وہ کہاں ہیں۔ راجا بہت اچھا آدمی ہے۔ اس نے انہیں کچھ بھی نہیں بتایا ہے اور نہ ہی بتانے کا ارادہ ہے۔ اس نے پیغام بھجوایا تھا کہ میں تمہیں خبردار کر دوں۔ کیونکہ پولیس والے یقیناً یہاں بھی آئیں گے۔ چنانچہ میں نے ایسی تمام اشیا تمہارے کمرے سے ہٹا دی ہیں۔ جن سے تمہاری یہاں سکونت کا پتا چل سکتا تھا۔"

"تو اب میں کیا کروں؟" علی نے پژمردہ آواز میں پوچھا۔

"تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔"

"فوراً چلا جاؤں۔" علی کی آواز پست اور ٹوٹی ہوئی تھی "مگر کہاں جاؤں گا۔ میں تو بالکل ناواقف ہوں۔"

بشیر احمد چپ ہو گئے۔ چند لمحے تفکر آمیز نظروں سے علی کو دیکھتے رہے "بلیک برن چلے جاؤ۔"

"بلیک برن؟"

"ہاں۔" بشیر احمد نے کہا "وہاں میرا ایک واقف ہے۔ تم فی الحال اس کے پاس چلے جاؤ۔ مگر جلدی کرو۔ یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔ وہ لوگ کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔ وہ یہاں تلاشی لیں گے اور ہم لوگوں سے پوچھ گچھ کریں گے۔ تم ان کے آنے سے پہلے ہی نکل جاؤ۔"

علی کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے شکستہ آواز میں کہا "بشیر بھائی، یہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ کچھ نہیں بتائیں گے۔ لیکن اگر دوسروں

نے۔۔۔"

"کوئی کچھ نہیں بتائے گا۔ میں سب کو سمجھا دوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔" بشیر احمد نے کہا "آؤ میں تمہارا ضروری سامان بیگ میں رکھوا دوں۔"

"راجا کا کیا ہوگا؟" معاً علی نے گلوگیر آواز میں کہا۔

بشیر احمد نے زور سے کہا "میاں اب میں کیا بتاؤں اس کا کیا ہوگا۔ غیر قانونی طور پر یہاں آنے میں یہی مصیبت ہے۔ پکڑے جائیں تو بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ قانون بھی کوئی مدد نہیں کرتا۔ اب وہ لوگ راجا کو حوالات میں رکھیں گے۔ پھر اسے عدالت میں پیش کیا جائے گا اور مقدمہ چلے گا۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ راجا مقدمہ ہار جائے گا۔"

"کیا وہ لوگ اسے واپس بھیج دیں گے؟" علی نے سہمی ہوئی نظروں سے بشیر احمد کو دیکھا۔

"ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ ممکن ہے' عدالت اسے اپیل کا حق دے دے۔ مگر یہ بعد کی بات ہے۔ تم وقت ضائع مت کرو۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں بس میں بٹھا دوں گا۔"

علی شکستہ قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

جتنی دیر بس چلتی رہی' علی پچھلی سیٹ پر گم صم بیٹھا رہا اور خالی' ویران نظروں سے باہر دیکھتا رہا۔ خزاں نے اپنا سایہ چپے چپے پر پھیلا رکھا تھا۔ پیڑ سبزے سے محروم تھے۔ بس ٹنڈ منڈ سیاہ شاخیں نظر آرہی تھیں۔ سارے میں ایک ناقابلِ بیان ویرانی اور اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں بھیڑیں گھاس چرتی نظر آرہی تھیں۔ کہیں کہیں فارم ہاؤس کی چمنی سے کثیف دھواں نکل کر کاہلی سے فضا میں پھیل رہا تھا۔ علی اس پورے منظر کو جو ایک اداس پینٹنگ کی طرح نظر آتا تھا' یوں دیکھ رہا تھا جیسے نہ دیکھ رہا ہو۔ اور درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن تو راجا میں الجھا ہوا تھا۔ راجا۔۔۔ اب راجا کا کیا ہوگا۔ وہ خود تو بچ کر نکل آیا تھا۔ مگر راجا پکڑا گیا تھا۔ اب وہ لوگ اسے محض رسمی کارروائی کے لیے کسی عدالت یا ٹرائی بیونل میں پیش کریں گے۔ چند جملوں میں ضابطے کی کارروائی پوری ہو جائے گی۔ پھر وہ اسے جہاز میں بٹھا دیں گے۔ راجا واپس چلا جائے گا۔۔۔ اور وہ سپنا مرجائے گا جسے آنکھوں میں سجا کر وہ انگلینڈ آیا تھا۔ راجا۔۔۔ کتنا اچھا آدمی ہے وہ۔ مخلص اور ہمدرد' دوستوں کا دوست۔ اس نے علی کی کتنی مدد کی تھی۔ علی تو بالکل بے سہارا' انجان اور ناواقف تھا۔ مگر راجا نے ہر طرح سے اس کی مدد کی۔ پل پل ساتھ نبھایا تھا۔ مگر اب یہ ساتھ چھوٹ رہا ہے۔ علی اب اکیلا رہ جائے گا۔ یہ تصور حد درجہ اذیت ناک لگا۔ اس کے دل میں یکایک ایک ہوک سی اٹھی۔ ایک پچھتاوے نے سر اٹھایا۔ ساتھ ہی اسے ڈر بھی لگا۔ اب وہ اکیلا رہ جائے گا تو کیا کرے گا۔ چاروں طرف انجانے خطرات گھات لگائے بیٹھے ہیں اور اس کی تاک میں ہیں۔ کیسے وہ ان سے بچے گا۔ راجا کے ہونے سے کتنا سہارا تھا۔ اب وہ سہارا ختم ہوا۔ اسے یکایک پھر پچھتاوا ہوا۔ کیا ضروری تھا کہ راجا پکڑا گیا اور وہ بچ گیا۔ وہ بھی پکڑا جاتا تو کیا حرج تھا۔ دونوں ساتھ ہی آئے تھے' ساتھ ہی واپس چلے جاتے۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں ایک خواہش شدت سے ابھری۔ دل چاہا کہ اگلے اسٹیشن پر اترے اور واپس چلا جائے۔ سیدھا پولیس اسٹیشن جا کر اپنے آپ کو پیش کر دے اور کہہ دے کہ وہ بھی راجا کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ مگر یہ ایک لمحاتی کیفیت تھی۔ چند لمحوں میں ابال بیٹھ گیا تو اداسی اور بے بسی پھر غالب آگئی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اپنے خیالات کے حصار میں قید اور لاتعلق نظروں سے باہر دیکھتا رہا۔

مانچسٹر میں بس بدلی۔ پھر بولٹن اور ڈارون سے ہوتا ہوا آخر کار وہ بلیک برن پہنچ گیا۔

بس سے اتر کر وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اور حیرت بھری نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے بلیک برن کا نام سنا تھا مگر کبھی اس طرف آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہاں اتنا اس کے علم میں تھا کہ بلیک برن ایک چھوٹا سا صنعتی شہر ہے۔ اس شہر میں کوئی بھی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔ ماسوا اس کے کہ اس شہر میں مسجدیں بہت ہیں اور ایشین بھی کافی تعداد میں آباد ہیں۔ لیکن اگر یہ سچ ہے تو وہ ایشین کہاں ہیں؟ کیونکہ بس اسٹیشن پر تو کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ سامنے کیتھڈرل کی پُرشکوہ عمارت تھی۔ پیچھے ریلوے اسٹیشن۔ دائیں جانب کچھ ایسی عمارتیں نظر آرہی تھیں' جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید مارکیٹ ہے۔ بس اسٹیشن پر زیادہ چہل پہل بھی نہیں تھی۔ دو عورتیں سامنے بینچوں پر بیٹھی تھیں۔ جبکہ کچھ افراد چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ بلیک پول جانے والی ایک بس کے پاس چار پانچ افراد کھڑے تھے۔ مگر ان میں ایشین کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ دراصل وہ اس جستجو میں تھا کہ کوئی "اپنا" آدمی نظر آجائے تو اس سے اپنے مطلوبہ پتے کے بارے میں پوچھے۔

پھر اس کی نظر معاً ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف اٹھی۔ وہاں ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اسے یکایک ایک سہارا سا محسوس ہوا۔ کیونکہ ڈرائیور ایک ایشین تھا اور ٹیکسی کے قریب کھڑا سگریٹ پینے میں مصروف تھا۔ وہ بیگ اٹھا کر سست قدموں سے چلتا ہوا ڈرائیور کے پاس پہنچا۔

"اچھا تو آپ جانسٹن اسٹریٹ جائیں گے؟" ڈرائیور نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا۔

"ہاں۔"

"بیٹھیں۔"

ٹیکسی روانہ ہوئی۔ وہ خاموش گم صم نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ٹیکسی ٹاؤن سنٹر سے ہوتی ہوئی ایک بڑے راؤنڈ اباؤٹ پر پہنچی پھر ایک پارک کے وسیع گیٹ کے سامنے سے گزری۔ پھر

مانٹیگو اسٹریٹ پر پہنچ کر جانسٹن اسٹریٹ پر مڑگئی۔ اس سڑک پر رونق کم تھی۔ مکانات خاصے پرانے تھے اور اکثر مکانوں کی حالت کہنگی کے باعث خاصی خستہ نظر آرہی تھی۔ علی کو کچھ ایشین صورتیں نظر آئیں۔ چند ایک عورتیں اور بچے۔ دو ایشین گروسری شاپ دکھائی دیں۔ ایک وڈیو شاپ کی وسیع کھڑکی میں ہندوستانی فلموں کے دو پوسٹر چپکے ہوئے تھے۔ وڈیو شاپ کے آگے جو گلی تھی، ٹیکسی ڈرائیور یکایک اس میں مڑگیا اور کتھئی رنگ کے ایک دروازے کے سامنے گاڑی روک لی۔

"لو بھئی آپ کا مکان آگیا۔"

اس نے کرایہ ادا کیا اور فٹ پاتھ پر کھڑا خاموش نظروں سے ٹیکسی کو دیکھتا رہا۔ جب ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو اس نے زور سے سانس لی اور آگے بڑھ کر اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔

کوئی دو منٹ بعد دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا ایک خاصا جسیم آدمی تھا۔ تہمد اور بنیان میں ملبوس۔ کنپٹیوں پر چند ایک بال موجود تھے، جنہوں نے اسے بالکل ہی فارغ البال ہونے سے صاف بچالیا تھا۔ آنکھوں پر ایک گول چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ اس نے ذرا غور سے علی کو دیکھا۔

"کیا بات ہے؟"

"جی۔" علی نے تھوک نگلا "میرا نام آصف علی ہے۔ اور مجھے غلام احمد صاحب سے ملنا ہے۔"

"میں ہی غلام احمد ہوں۔" اس آدمی نے کہا۔ پھر یکایک چونک کر بولا "تم کہیں راچڈیل سے تو نہیں آئے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"ارے تو پھر آؤ، اندر آؤ۔ بشیر احمد صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے اطلاع دی تھی کہ تم پہنچ رہے ہو۔ میں تو ایک طرح سے تمہارا انتظار ہی کررہا تھا۔ سب ٹھیک تو ہے نا، راستے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔"

"جی نہیں۔" وہ بیگ اٹھا کر اندر داخل ہوا۔

○☆○

غلام احمد ایک آزاد منش آدمی تھے۔ زندگی گزارنے کے لیے انہوں نے اپنے طور و طریق خود وضع کیے تھے جن میں وہ کسی قسم کی دخل اندازی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ٹی وی، فلمیں اور شراب ان کے شوق تھے۔ کوئی تیس سال قبل انگلستان آئے تھے۔ اٹھائیس سال تک کارپٹ کی مختلف فیکٹریوں میں کام کیا تھا۔ بچوں کی پرورش کی تھی۔ پھر ان کی شادیاں کیں، بہو اور داماد وطن سے انگلستان آگئے تو پریسٹن نیو روڈ کے اوپر ایک اسٹریٹ میں دو مکان خریدے اور انہیں وہاں آباد کیا۔ ساتھ میں بیوی کو بھی بیٹے کے پاس بھیج دیا۔ کسی اختلاف کی بنا پر نہیں بلکہ اس بنا پر کہ ان کی آزادی میں خلل نہ پڑے۔ دراصل ان کی اپنی دلچسپیاں تھیں۔ انہوں نے دو سٹیلائٹ ڈشیں لگا رکھی تھیں۔ ایک بڑی ڈش صرف اس مقصد کے لیے تھی تاکہ وہ یورپ کے ان چینلز کو کیچ کرسکیں، جن پر رات گئے، عریاں فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ اردو فلمیں بھی باقاعدگی سے دیکھتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن میں بچوں کی طرف جاتے اور ضروری خریداری وغیرہ کردیتے۔ دوسرے ضروری امور بھی انجام دیتے۔ پھر شام کو واپس آکر ٹیلی وژن کے سامنے صوفے پر بیٹھتے۔ کوئی اردو فلم وڈیو پر لگا دیتے۔ پھر بیئر کا ایک ڈبا کھول لیتے اور چسکیوں کے ساتھ فلم دیکھتے رہتے۔ اب یہ دلچسپیاں اور مشاغل ایسے تھے کہ بیوی بچوں کی موجودگی میں پورے نہیں ہوسکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بیوی بچوں کے لیے علیحدہ رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ ایک ڈبا پینے کے بعد وہ الائچی منہ میں ڈالتے اور ایک بار پھر بیٹے کے گھر کا رخ کرتے۔ کھانا کھا کر اور نصف گھنٹا چہل قدمی کے بعد واپس آتے تو پھر رات گئے تک ٹی وی دیکھتے رہتے۔ ان کی یہ تفریحات سطحی اور بے مقصد تھیں۔ بقول ان کے صرف نظر کی "عشرت" اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مزاجاً وہ ایک خوش مزاج اور ملنسار آدمی تھے۔ اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ بیوی کے لیے بھی ان کے دل میں اتنی محبت اور اتنی عزت تھی کہ انہوں نے کبھی کسی دوسری عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

ان کے گھر میں تین بیڈ روم تھے۔ ایک میں وہ خود رہتے تھے۔ دوسرے کمرے میں رفیق کا قیام تھا۔ تیسرا انہوں نے علی کو دے دیا۔ رفیق اور غلام احمد کے درمیان گہرا ذہنی ربط و ضبط تھا۔ باوجود اس کے کہ دونوں کی عمر میں خاصا تفاوت تھا مگر ان کے مشاغل اور خیالات ایک تھے۔ مزاج میں ہم آہنگی تھی۔ دونوں ہی شراب کے شوقین تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ غلام احمد ہمیشہ گھر میں پیتے تھے اور ان کا ایک کوٹا مقرر تھا۔ جبکہ رفیق کی ہر شام قریبی پبلک ہاؤس یعنی شراب خانے میں گزرتی تھی۔ شام شروع ہوتے ہی وہ پب میں چلا جاتا اور گیارہ بجے واپس آتا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر ٹی وی دیکھتا اور پھر سونے چلا جاتا۔

رفیق کی عمر کوئی تیس سال تھی۔ وہ کوئی چار سال قبل انگلستان آیا تھا مگر نہ تو اپنی غریبی مٹانے کے لیے اور نہ ہی اس بنا پر کہ مغرب کی چمک دمک سے متاثر تھا۔ بلکہ انگلستان آنے کا سبب یہ تھا کہ اس کے دور کے ایک ننھیالی رشتے دار عرصے سے انگلستان میں مقیم تھے۔ ان کی ایک لڑکی جوان ہوئی تو انہیں ایک عدد داماد کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ وہ وطن پہنچے اور اتفاق سے رفیق کو پسند کر بیٹھے۔ شادی ہوئی، ویزے کا مرحلہ طے ہوا اور وہ انگلستان آگیا۔ یہاں پہنچ کر اسے واقعی اچھا لگا، جب اس نے شہروں کی صفائی ستھرائی دیکھی۔ دفاتر کا عمدہ نظام دیکھا اور یہ دیکھا کہ لوگ عام طور پر قوانین اور ضابطوں کا احترام کرتے ہیں۔ نیز یہ مشاہدہ کیا کہ پولیس کے اہلکار اور سرکاری افسران عام آدمی سے گفتگو کرتے ہیں تو اس کی ماں بہن ایک نہیں کرتے بلکہ آپ جناب سے خطاب

کرتے ہیں۔ اسپتالوں میں ہر طرح کا علاج اور سہولتیں مفت مہیا کی جاتی ہیں۔ اشیائے خورونوش کی کوئی کمی نہیں۔ اسے واقعی اچھا لگا۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ یہ سارے کام تو ہم بھی اپنے ملک میں کرسکتے ہیں۔ اگر قانون کی عمل داری پوری طرح قائم کردیں تو.... مگر ان سب خوش کن باتوں کے باوجود اسے مایوسی اور رنج کا احساس بھی ہوا جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کے ننھیالی رشتے دار یعنی اس کے سسر صاحب جنہیں وہ پھوپا کہتا تھا' وہ نہیں ہیں' جو وہ نظر آتے تھے۔ سسر صاحب جب بھی وطن جاتے تھے تو اپنی شان و شوکت اور دولت و امارت کے قصے سناتے نہیں تھکتے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق بہت بڑا کاروبار تھا ان کا۔ کافی بڑی جائداد تھی۔ بینک بیلنس تھا۔ بڑے عالی شان مکان میں رہتے تھے۔ جس کا چپہ چپہ قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان کے پاس ہر شے بے حد قیمتی تھی۔ مثلاً ان کے سوٹ چالیس چالیس ہزار روپے کے تھے۔ ایک کار کی قیمت ایک کروڑ روپے تھی۔ جبکہ دوسری کار پچاس لاکھ میں آئی تھی۔ ان کے گھر کے روز مرّہ اخراجات کا تخمینہ تقریباً ایک لاکھ روپے ماہانہ تھا۔ ان کی یہ باتیں سن کر اور ان کی بیوی کے زیورات دیکھ کر عزیز و اقارب نہ صرف حد درجہ مرعوب ہوتے بلکہ شدید احساسِ کمتری میں بھی مبتلا ہوجاتے۔ خود وہ بھی بہت متاثر ہوا تھا۔ اور شاید شادی کے لیے ہاں کرنے کا سبب بھی یہی تھا۔ ماں باپ تو تھے نہیں۔ وہ اس کے بچپن ہی میں ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے تھے۔ خالہ نے جو بیوہ تھیں' اسے پالا تھا۔ انہوں نے کہا "بیٹا شادی کرلے اور چلا جا ولایت۔ تیری زندگی سنور جائے گی۔ میرا کیا ہے' بوڑھی عورت ہوں۔ آج نہیں تو کل رختِ سفر باندھ لوں گی۔ ہاں بس اتنا ہے کہ میری بیٹی کا خیال رکھنا۔ تیری بھی بڑی بہن جیسی ہے وہ۔ اس کا شوہر بے چارہ غریب آدمی ہے۔ کچھ پیسہ میری بیٹی کو بھیج دیا کرنا تاکہ اس کے بچے اچھی طرح پل جائیں۔" چنانچہ اس نے شادی کرلی۔ مگر انگلستان پہنچا تو پھوپا صاحب کا اصل روپ سامنے آیا۔ ان کا مکان تین بیڈ روم کا تھا۔ ایک عام سا مکان جیسے ولایت میں عام آدمیوں کے ہوتے ہیں۔ پورے مکان میں قالین بھی بچھا ہوا تھا مگر وہ قالین اوسط درجے کا تھا اور اس میں کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ انگلستان میں سب ہی گھروں میں قالین اور صوفے ہوتے ہیں۔ دروازے پر دو کاریں بلاشبہ کھڑی تھیں۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ وہ عام قسم کی پرانی کاریں تھیں اور ان کی مجموعی قیمت ڈیڑھ ہزار پاؤنڈ یعنی موجودہ شرحِ تبادلہ کے حساب سے ایک لاکھ روپے سے زیادہ نہیں تھی۔ جس کاروبار کا ذکر وہ دھوم دھام سے کرتے تھے' اس کا کہیں وجود نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک چھوٹی سی گروسری شاپ چلاتے تھے اور ان کا بیٹا مقامی بسوں میں کنڈیکٹر تھا۔ جب یہ تمام حقائق رفیق کے علم میں آئے تو اسے نہ صرف مایوسی ہوئی بلکہ انتہائی طیش بھی آیا۔ اس کا دل چاہا کہ پھوپا صاحب کا گریبان پکڑے اور بے نقط سنا ڈالے۔ شرم آنا چاہیے آپ اور آپ جیسے بے شمار لوگوں کو۔ آپ جیسے لوگ وطن جاتے ہیں تو زمین پر پاؤں نہیں رکھتے۔ ناک سے رومال نہیں اترتا۔ آپ لوگ اپنی لن ترانی سے "وہاں" والوں کو ذلیل کرتے ہیں۔ ان کے دل میں احساسِ کمتری پیدا کرتے ہیں۔ نتیجتاً وہ لوگ آپ کو رشک کی نظر سے دیکھتے اور خود بھی یورپ اور امریکا کے جنون میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ کیا ملتا ہے آپ کو یہ تمام جھوٹ بول کر۔ اوپر سے آپ لوگ نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں۔ شرم آنا چاہیے۔ مگر اس نے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے پھوپا صاحب دراصل بہت ہی چھوٹے آدمی ہیں۔ ظرف کے چھوٹے' ضمیر کے چھوٹے اور ذہن کے چھوٹے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کا اپنا قد ان کے مقابلے میں بہت اونچا ہے۔ چنانچہ اسے پھوپا پر ترس آیا' اس نے زبان کھولنے سے احتراز کیا۔

دوسری مایوسی اسے اپنی بیوی کی طرف سے ہوئی۔ اس کی بیوی خاصی خوش شکل تھی۔ مگر اس کی چند ایک مجبوریاں تھیں۔ مثلاً یہ کہ اردو بولنے میں اسے الجھن ہوتی تھی' لہٰذا صرف انگریزی بولتی تھی۔ گھر کے کام کاج سے مجبور تھی۔ کیونکہ "بے چاری" کو خود اپنی تزئین و آرائش سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ ایک مشکل یہ تھی کہ وہ برطانیہ میں پلی بڑھی تھی اس لیے اس کے ذہن میں برتری کا احساس تھا۔ ان "مجبوریوں" کا نتیجہ اس صورت میں نکلا کہ میاں بیوی میں جو ذہنی فاصلہ پہلے سے موجود تھا' وہ کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گیا۔ دو چار "جنگیں" ہوئیں۔ بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ پھر ایک دن بیوی نے اپنا میک اپ باکس سنبھالا اور باپ کے گھر چلی گئی۔

پھوپا صاحب نے رفیق سے کہا "تمہیں بیوی کا درجہ معلوم ہے۔"

رفیق نے سرہلایا "ہاں' لیکن شاید آپ کی بیٹی شوہر کے درجے سے واقف نہیں ہے۔"

پھر طلاق ہوگئی۔ جس مکان میں رفیق اپنی رفیقِ حیات کے ساتھ رہتا تھا' وہ اس کے باپ کا تھا لہٰذا رفاقت ٹوٹی تو اس نے اپنا بوریا بستر اٹھایا اور غلام احمد کے پاس آگیا۔ چونکہ ڈھائی سال کا عرصہ بیت چکا تھا اور اسے مستقل قیام کی اجازت مل چکی تھی' لہٰذا واپس جانا یا نہ جانا اس کی اپنی صوابدید پر تھا۔ فی الحال اس نے کچھ بھی طے نہیں کیا تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ بس وقت گزر رہا تھا۔ صبح کی شفٹ میں کام کرتا تھا۔ سہ پہر کو گھر آتا۔ کھانا پکاتا پھر شام کو پب کا رخ کرتا۔ لیکن شراب نوشی کا شوق فروعی تھا۔ شاید اس طرح وہ "فرار" حاصل کرنے کی ایک مصنوعی کوشش کرتا تھا۔ ورنہ بنیادی طور پر وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ خوش مزاج اور ملنسار اور فراخ دل۔ علی سے دو چار دن کے اندر یوں گھل مل گیا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔

ایک دن علی نے کہا "تو تم نے ابھی تک طے نہیں کیا ہے کہ آئندہ کیا کرو گے۔"

"ہاں۔" رفیق نے سرہلایا۔

"شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"ضرور کروں گا۔" رفیق نے پھر سرہلایا "لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میں اس چکر میں ہوں کہ کچھ پیسہ اکٹھا کروں۔ کیونکہ میری بہن کرائے کے مکان میں رہتی ہے۔ اس کا شوہر گو غریب ہے مگر بہت نیک آدمی ہے۔ اس کی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ کرائے میں نکل جاتا ہے۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ ان کے لیے ایک مکان بنوا دوں۔ یہ مرحلہ طے ہو جائے تو پھر شادی کروں گا۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" علی نے توصیفی لہجے میں کہا "آج کل کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے۔"

"یار وہ میری ایک ہی تو بہن ہے۔"

علی نے چند لمحوں بعد کہا "کبھی بیوی سے سامنا ہوا؟ وہ بھی تو اسی شہر میں رہتی ہے۔"

"ہاں کبھی کبھار مارکیٹ میں نظر آجاتی ہے۔ دو چار باتیں بھی کر لیتے ہیں۔ اور بس۔" رفیق نے جواب دیا "یہ سوال تم نے اگر اس تجسس کے تحت کیا ہے کہ مفاہمت کی کوئی صورت ہے یا نہیں۔ تو جواب یہ ہے کہ نہیں۔ ہماری شادی درحقیقت بالکل بے جوڑ تھی اور اسے ایک دن ختم ہونا ہی تھا۔ اب ہم دونوں الگ ہو گئے ہیں تو وہ بھی خوش ہے اور مجھے بھی کوئی خاص پچھتاوا نہیں۔"

چند دن انتظار کرنے کے بعد علی کو پریسٹن کی ایک لانڈری میں ملازمت مل گئی۔ درحقیقت وہ لانڈری نہیں بلکہ بلیچنگ فیکٹری تھی جہاں کپڑے کے کارخانوں سے آیا ہوا کورا کپڑا بلیچ کیا جاتا تھا۔ مگر عرفِ عام میں وہ فیکٹری لانڈری کہلاتی تھی اور ان لوگوں میں بہت مقبول تھی جو چوری چھپے اور غیر قانونی طور پر کام کرنا چاہتے تھے۔ فیکٹری کا منیجر لوگوں سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ وہ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کیوں غیر قانونی طور پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب رفیق کا ایک دوست علی کو لے کر منیجر کے پاس پہنچا تو اس نے فوراً کام دے دیا۔ اس بات کا ذکر تک نہیں ہوا کہ علی "غیر قانونی" ہے۔ اجرت ڈیڑھ پاؤنڈ فی گھنٹا مقرر ہوئی۔ ملازمت کا حصول اور اجرت کی شرح علی کے لیے خوشی کا سبب نہیں بنیں۔ بلکہ اسے شدید مایوسی اور رنج کا احساس ہوا۔ وہ ہفتے میں ساٹھ ستر گھنٹے جان توڑ محنت کرے گا اور نتیجے میں سو پاؤنڈ سے بھی کم ملیں گے۔ بھلا اتنی آمدنی میں کیا ہو گا۔ کیسے اس کے مسائل حل ہوں گے۔ کیسے ضروریات پوری ہوں گی۔ لیکن اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ اگلے دن سے اس نے کام پر جانا شروع کر دیا۔

رفیق کا دوست اجمل بھی "لانڈری" ہی میں کام کرتا تھا مگر قانونی طور پر۔ اس کے پاس ایک پندرہ سال پرانی کار تھی جس کا نام اس نے "رولز رائس" رکھا ہوا تھا۔ علی رولز رائس پر اجمل کے ساتھ ہی کام پر جاتا تھا۔ اجمل قابل بھروسا آدمی تھا۔ اس نے اس بات کو مستقل طور پر بھلا دیا کہ علی کا داخلہ برطانیہ میں غیر قانونی ہے۔ ہاں کبھی کبھی اسے احتیاط کی تاکید ضرور کرتا۔ اور علی نے ہر ممکن احتیاط بھی کی۔ غلام احمد کے مکان میں اس طرح رہتا جیسے مکان تو کیا اس شہر میں ہی اس کا وجود نہ ہو۔ کام ختم کر کے واپس آتا تو گھر میں ہی رہتا۔ اگر کبھی باہر جاتا بھی تو ویران راستوں پر چلنا پسند کرتا۔ راستہ چلتے لوگوں کو شک بھری نظروں سے دیکھتا۔ اگر کوئی پولیس مین نظر آجاتا تو اس کی سانس رکنے لگتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ پولیس مین اسی کی تلاش میں ہے۔ اور جونہی وہ علی کو دیکھے گا گرفتار کر لے گا۔ چنانچہ وہ فوراً کنی کترا کر اِدھر اُدھر ہو جاتا۔ چھٹی کے اوقات میں اگر اس کا باہر جانے کے لیے کبھی جی چاہتا بھی تو پبلک پارک کا رخ کرتا۔ کیونکہ پارک عموماً ویران رہتا تھا۔ وہ پارک کے کسی سنسان گوشے میں بیٹھ جاتا، تنہا، خاموش اور اپنی ذات کے خول میں بند۔ اردگرد میں صرف گھنے درخت ہوتے اور روڈا ڈینڈرم کی گھنی جھاڑیاں اور گہری خاموشی۔ اسے یوں محسوس ہوتا کہ پوری دنیا میں وہ بالکل تنہا ہے اور پوری طرح محفوظ۔ عافیت کا یہ احساس اسے ایک عجیب سی اور ناقابلِ بیان مسرت عطا کرتا۔

وہ ہر دوسرے تیسرے دن بشیر احمد کو فون کرتا تھا کہ راجا کے بارے میں معلوم کر سکے۔ غالباً تیسرا ہفتہ تھا جب بشیر احمد نے خود ہی اسے فون کیا اور اطلاع دی کہ راجا کو واپس بھیج دیا گیا ہے۔

"کب؟" اس کا دل بیٹھنے لگا۔

"آج صبح۔" بشیر احمد نے کہا "انہوں نے اسے بہت پریشان کیا تھا۔ امیگریشن والوں کو یقین تھا کہ وہ تنہا نہیں آیا ہو گا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوں گے۔ چنانچہ وہ پوچھ گچھ کرتے رہے مگر راجا نے زبان نہیں کھولی۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ راجا کچھ نہیں بتائے گا تو انہوں نے اسے غالباً کسی افسر یا مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا۔ ضابطے کی کارروائی چند منٹ میں پوری ہو گئی اور پھر آج صبح انہوں نے اسے جہاز کے کپتان کے حوالے کر دیا۔"

"کپتان کے حوالے؟" علی نے سہم کر کہا۔

"ہاں، جہاز میں وہ کپتان کی تحویل میں ہو گا اور ایک قیدی کی طرح سفر کرے گا۔ یہی طریقہ ہے۔ جب جہاز اپنے ملک میں پہنچے گا تو کپتان باضابطہ طور پر اسے وہاں کی پولیس کے حوالے کر دے گا۔"

علی نے اپنے بدن میں ایک سرد لہر کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ چند لمحے چپ رہا پھر بولا "آپ اس سے ملے تھے؟"

"ہاں، صرف چند منٹ کے لیے اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں اس کی نیک خواہشات تم تک پہنچا دوں۔" بشیر احمد نے کہا۔ پھر قدرے وقفہ دے کر اضافہ کیا "ویسے میاں

علی! آج کل تم ذرا ہوشیاری اور احتیاط سے رہنا۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"کیوں؟"

"دیکھو۔" بشیر احمد نے کہا "بات یہ ہے کہ راجا نے بے شک انہیں کچھ نہیں بتایا ہے۔ لیکن انہیں پورا یقین ہے کہ راجا تنہا نہیں آیا تھا۔ نیز یہ کہ چوہدری کرم داد کے مکان میں اور بھی کئی لوگ ایسے تھے جو ناجائز طور پر یہاں آئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے اور صدیق وغیرہ سے بڑی طویل گفتگو کی تھی اور چوہدری کرم داد کو بھی برمنگھم سے بلوایا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے پتا چلا کہ امیگریشن والوں نے تمہاری فیکٹری میں بھی خاصی پوچھ گچھ کی تھی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ لوگ تفتیش جاری رکھیں گے۔ ان کے ذرائع بہت وسیع ہیں اور طریقۂ کار بڑا سائنٹیفک۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح تمہارے اور نواز شاہ کے بارے میں معلوم کرلیں گے۔ لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ تم بہت ہوشیار رہنا۔"

"جی میں احتیاط رکھوں گا۔"

پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گیا۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ غلام احمد بیٹے کے گھر گئے ہوئے تھے۔ رفیق شاید پب میں تھا۔ علی خاموش بیٹھا رہا اور ٹھہری ہوئی ویران نظروں سے کھڑکی کے باہر دور تک پھیلے سیاہ بادلوں کو گھورتا رہا۔ اس کا ذہن مختلف دلآزار خیالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ تو راجا چلا گیا؟ آخر کار بدشگونی کے نادیدہ ہاتھ نے اسے پکڑلیا اور وہ واپس چلا گیا۔ اس کے ساتھ صرف چند مہینے ہی گزرے تھے لیکن ان چند مہینوں میں وہ کتنا قریب آگیا تھا' رگِ جاں جتنا قریب۔ کیونکہ اسے دوستی کرنے کا ہنر آتا تھا۔ علی کو وہ دن یاد آیا جب بلجیم میں پہلی بار اس کا سامنا راجا سے ہوا تھا۔ پھر سفر کے مناظر یاد آئے اور راچڈیل میں گزرا ہوا وقت۔ ایک ہی کمرے میں رہائش۔ ایک ساتھ کھانا پکانا۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ دل کے رشتے شاید ایسے ہی ہوتے ہیں کہ دو اجنبی غیر محسوس طور پر اتنے نزدیک آتے ہیں کہ ایک دوسرے کے رفیق اور ہمدم بن جاتے ہیں۔ راجا اور علی کا ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ علی کو تو کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ ساتھ ہی رہیں گے۔ اسے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ قسمت کا اَن دیکھا ہاتھ کبھی ان کا راستہ بدل بھی سکتا ہے۔ مگر یہ ہونی ہوگئی تھی۔ راجا چلا گیا تھا اور علی جانسٹن اسٹریٹ کے اس چھوٹے سے مکان میں بیٹھا ہوا اسے یاد کررہا تھا۔ رنج اور پچھتاوے کے عذاب میں مبتلا۔ پچھتاوا اور پشیمانی کہ وہ کیوں بچ گیا۔ وہ بھی پکڑا جاتا اور راجا کے ساتھ ہی چلا جاتا تو کیا برا تھا۔

راجا میرے یار کہاں ہو تم؟

راجا تو چلا گیا۔ مگر اس کے جانے کا ردِعمل یہ ہوا کہ علی مزید خوف زدہ ہوگیا۔ وہ کام پر جاتا مگر چوروں کی طرح۔ کام پر بھی سب سے الگ تھلگ رہتا۔ لوگوں کو اپنا نام و پتا غلط بتاتا۔ فیکٹری میں جن لوگوں سے واقفیت ہوئی' ان سے ربط ضبط بڑھانے میں احتیاط کی۔ کبھی انہیں اپنے گھر نہیں بلایا اور نہ ہی خود کسی کے گھر گیا۔ اس کی دوستی صرف رفیق اور اجمل تک محدود تھی۔ مارکیٹ جانا بالکل بند کردیا۔ بس کبھی کبھی بہت جی چاہتا تو پارک چلا جاتا۔

کام وہ چھ دن کرتا تھا۔ جب نوکری کے حصول کے لیے گیا تھا تو کام کی نوعیت کا قطعی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ مگر جب نوکری شروع کی تو منکشف ہوا کہ کام بہت مشقت طلب اور تکلیف دہ ہے۔ لانڈری میں اسٹیم تھی' بلیچ اور دوسرے کیمیکل اور بھاری مشینیں۔ صبح سے شام تک کام کرتے کرتے اس کا جسم چکنا چور ہوجاتا۔ سانس پھول پھول جاتی اور ٹانگیں اتنی شکستہ ہوجاتیں کہ قدم اٹھانا دشوار ہوجاتا۔ اتنی جان توڑ محنت کے بعد' ہفتے کے آخر میں جب اس کے ہاتھ پر صرف اسّی یا نوّے پاؤنڈ آتے تو اس کا دل بیٹھنے لگتا۔ لعنت ہے' کتنا سستا بیچ رہا ہے وہ اپنے آپ کو۔ کوڑیوں کے مول۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ "جائز" طور پر کام کررہا ہوتا تو اسے کم از کم ڈھائی سو پاؤنڈ ملتے۔ لیکن وہ تو غیر قانونی ہے۔ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ یہ ہرجانہ تو اسے بھرنا ہی ہے۔ اس نے ایک جرم کیا ہے۔ اس کی سزا بھی اسے ضرور ملے گی۔ دوسرے لوگ اس کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور وہ کچھ نہیں کرسکے گا۔ مجبوری۔۔۔ مجبوری۔۔۔ تاہم سوال یہ ہے کہ مجبوری کب تک۔ آخر کب تک وہ حالات کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہے گا۔ کب تک جرمانہ بھرتا رہے گا۔

مگر اس سوال کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

○☆○

ایک دن کام کے دوران میں طبیعت کچھ ست ہوگئی تو اس نے دو گھنٹے پہلے ہی چھٹی کرلی۔ اجمل کو اس نے اطمینان دلایا کہ فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ بس یا ٹرین سے گھر چلا جائے گا۔ پھر لاکر روم میں جاکر اس نے کپڑے بدلے اور فیکٹری سے باہر آیا۔ سہ پہر کی نرم دھوپ چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ مگر شمال کی جانب سے آنے والی مدھم ہوا کے باعث فضا خاصی سرد تھی۔ علی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بے دھیانی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا چلتا رہا۔ ٹاؤن سنٹر میں پہنچ کر اس نے ایک پیپر شاپ سے سگریٹ کی ڈبیا خریدی۔ پھر آگے بڑھا۔ اوڈین سینما کے پاس پہنچا تو معاً اس کی نظر ایک عورت پر پڑی۔ ایک طائرانہ سی نظر' اسے صورت کچھ پہچانی سی لگی۔ مگر اس نے کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ تاہم جب درمیانی فاصلہ کم ہوا تو عورت کی نظر بھی اس پر پڑی۔ عورت ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی' اس کے چہرے پر کشمکش کی جھلک نظر آئی پھر وہ معاً مسکرادی۔

وہ بھی ایک جھٹکے سے رک گیا اور حیرت زدہ انداز میں یکایک مسکرایا۔

یہ سارا عمل غیر شعوری اور غیر اختیاری تھا۔ دونوں کو قطعی

احساس نہیں تھا کہ وہ کیوں مسکرائے ہیں اور کیوں رک گئے ہیں۔ ذہن میں ایک برقی رو کی طرح واقفیت کا ایک انجانا احساس جاگا تھا۔ اور اس انجانے احساس کے تحت انہوں نے چند ثانیے ایک دوسرے کو دیکھا پھر عورت کے لبوں سے خود بخود نکلا۔

"آپ....؟"

اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ مگر ساتھ ہی وہ کچھ پشیمان بھی ہوا۔ کیونکہ پہچان نہیں پایا تھا کہ وہ عورت کون ہے' خفیف ہو کر بولا "آپ....؟"

عورت نے ہونٹوں پر زبان پھیری "آپ سے ملاقات ہوئی تھی نا ایک بار' شاید راچڈیل میں؟"

معاً اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا "ہاں راچڈیل کے ٹاؤن سنٹر میں۔ ہے نا' اس روز سردی بہت تھی اور.... اور' ہاں یاد آیا۔ آپ کا نام غالباً صفیہ بیگم ہے۔"

عورت ہنسی "ارے نہیں' رقیہ نام ہے' رقیہ بیگم' معاف کیجئے گا' مجھے آپ کا نام نہیں یاد آرہا...."

"آصف علی۔" اس نے اپنا نام بتایا۔

رقیہ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی "ابھی آپ پر نظر پڑی تو شک گزرا کہ شاید آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ پھر یاد آگیا کہ راچڈیل میں آپ نے میری مدد کی تھی۔ میری بہن وہاں رہتی ہے نا' اور میں اکثر وہاں جاتی ہوں۔ مگر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آپ تو شاید جرمنی سے آئے تھے۔ ہے نا' تو کیا واپس نہیں گئے۔"

"جرمنی؟" وہ چکرا گیا۔

"ہاں' آپ نے کہا تھا نا' کسی دوست کے بلانے پر آپ جرمنی سے یہاں آئے تھے۔"

اس نے ذہن پر زور دیا تو مہینوں پہلے بولا ہوا جھوٹ یاد آگیا۔ شرمندہ ہو کر مسکرایا' پھر مدھم آواز میں بولا "ہاں' واپس جانے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا ہے۔ ابھی چند مہینے یہیں رہوں گا۔ پھر کچھ فیصلہ کروں گا۔"

"مگر یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"میں یہاں کام کرتا ہوں۔"

"کام؟" رقیہ نے حیرت سے کہا "آپ یہاں کام کرتے ہیں۔ تو کیا یہیں آگئے ہیں؟ کس جگہ قیام ہے آپ کا؟"

اتنی دیر میں وہ خاصا سنبھل گیا تھا۔ چند لمحے پہلے والی پشیمانی اور کشمکش دور ہو چکی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آگیا تھا کہ وہ کون ہے اور اسے کیا کہنا ہے۔ چنانچہ اس نے اطمینان سے جھوٹ بولنا شروع کیا "میں یہاں نہیں ایکرنگٹن میں رہتا ہوں۔"

رقیہ مزید حیران ہوئی "مگر وہ تو بلیک برن کے پاس ہے اور یہاں سے کوئی دس بارہ میل دور ہے۔"

"ہاں۔" اب وہ قدرے اعتماد اور سکون سے بات کر رہا تھا۔ "دراصل راچڈیل میں کوئی معقول ملازمت نہیں ملی تو میں ایکرنگٹن آگیا۔ وہاں میرا ایک دوست ہے۔ پھر یہاں پریسٹن میں ایک اچھی نوکری مل گئی۔ فاصلہ دس بارہ میل ہی تو ہے۔ کام پر آنے جانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔"

"تو کیا آپ نے کار بھی لے لی ہے؟"

"نہیں' ایک دوست بھی ساتھ میں کام کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی کار میں آتا جاتا ہوں۔"

"کام کہاں کرتے ہیں؟"

وہ مسکرایا "یہاں نمبر برج کے قریب ایک نٹنگ فیکٹری ہے۔ اس میں اسسٹنٹ فورمین کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔" یہ جھوٹ اس نے اتنے سکون سے بولا کہ خود اسے بھی حیرت ہوئی۔

رقیہ چند ثانیے چپ رہی پھر کہنے لگی "کیا عجیب اتفاق ہے۔ ہماری ایک سرسری سی ملاقات راچڈیل میں ہوئی تھی۔ گمان بھی نہیں تھا کہ پھر کبھی سامنا ہو گا۔ مگر آج اتفاق سے.... ہے نا' زندگی میں اکثر کیسے انوکھے اتفاقات ہوتے ہیں۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"اور تو سب ٹھیک ہے نا۔" رقیہ نے مزید کہا "آپ کے گھر والے تو اچھے ہیں۔"

یہ کیا کہہ دیا رقیہ نے' نہیں' اسے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب وہ کیا بتائے اور کیسے بتائے کہ وہ ایک جھوٹی اور پُر فریب زندگی گزار رہا ہے۔ خوف اور مجبوری میں گھری ہوئی' اس کا وجود عدم سے عبارت ہے کہ وہ اس وقت رقیہ کے سامنے موجود ہے' پھر بھی نہیں ہے۔ وہ خود اپنے پیدا کردہ عذاب میں گھرا ہوا ہے اور کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ بلکہ سب کچھ غلط ہے۔ اس کے شب و روز' اس کی جدوجہد اور خود اس کی اپنی ذات' سب کچھ نفی ہے۔ وہ چوروں کی طرح رہتا ہے اور اپنے سائے سے بھی ڈرتا ہے۔ جان توڑ محنت کرتا ہے' پھر بھی اتنا پیسہ نہیں ملتا کہ اپنی اماں کو معقول رقم بھیج سکے اور خود اپنے اخراجات پورے کر سکے۔ وہ راتوں کو اکثر لاچار اور بے آسرا ہو کر رونے بھی لگتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف سے اسے مجبوریوں نے گھیرا ہوا ہے۔ ایک غیر مرئی زندان ہے' جس میں وہ بند ہے اور باہر نکلنے کی خواہش کے باوجود باہر نکلنے سے قاصر ہے۔ مگر وہ یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ سر سے پاؤں تک ایک جھوٹ تھا۔ اور جھوٹ ہی کے سہارے اسے رہنا تھا۔ چنانچہ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور قدرے تھکی ہوئی نظروں سے رقیہ کو دیکھا۔

"ہاں' سب خیریت ہے۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔" رقیہ خوش دلی سے بولی پھر مسکرا کر اضافہ کیا "اچھا اب میں چلتی ہوں۔ اماں انتظار کر رہی ہوں گی۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

رقیہ آگے بڑھ گئی۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا اور غیر ارادی طور پر

رقیہ کو دیکھتا رہا۔ کئی ماہ قبل جب راچڈیل کے ٹاؤن سنٹر میں اس نے رقیہ کو دیکھا تھا تو اس کی شخصیت اور سادگی اسے اچھی لگی تھی۔ آج بھی اس کی سادگی نے اس کے دل کے دروازے پر دستک دی۔ رقیہ نے سفید شلوار جمپر اور اس کے اوپر لمبا لیڈیز کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر حسبِ سابق رومال بندھا تھا۔ اس نے کوئی میک اپ نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ ہونٹوں پر لپ اسٹک تک نہیں تھی۔ اس کے باوجود اسے وہ اتنی اچھی لگی تھی کہ اس کے دل و دماغ پر ایک ایسی انوکھی وارفتگی اور محویت طاری ہوگئی تھی' جس سے وہ آشنا نہیں تھا۔ اور اسے اپنی اس کیفیت کا احساس بھی نہیں تھا۔ بس وہ خاموش کھڑا تھا' گردوپیش سے بے خبر اور رقیہ کو دیکھے جارہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بغلی گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ تب وہ معاً چونک کر اپنے آپ میں واپس لوٹا۔ خجل ہو کر زیرِ لب مسکرایا اور پھر سست قدموں سے آگے بڑھا۔

اس دن اجمل کسی مصروفیت کی بنا پر کام پر نہیں گیا تھا' علی نے صبح ہی صبح بس پکڑی اور کام پر پہنچ گیا۔ سہ پہر تک کام کیا۔ پھر چھٹی ہوگئی کیونکہ کام کم تھا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا کہ کام کم ہونے کی صورت میں چوری چھپے کام کرنے والوں کو چھٹی دے دی جاتی تھی تاکہ فیکٹری والے کچھ پیسہ بچا سکیں۔ علی نے منہ ہاتھ دھویا' کپڑے تبدیل کیے اور فیکٹری سے باہر نکلا پھر پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔ ٹاؤن سنٹر تک پہنچنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ اوڈین سینما کے پاس کھڑا ہوگیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کی نظروں میں تجسس بھی تھا اور تلاش بھی۔ حالانکہ خود اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کسی جستجو میں ہے اور یہ کہ اس کی نظریں غیر ارادی طور پر کسی کو تلاش کررہی ہیں۔ فٹ پاتھ پر آتی جاتی عورتوں میں کوئی ایشین عورت دکھائی دیتی' ساری یا شلوار جمپر میں ملبوس تو اس کی نظریں گہرے تجسس کے عالم میں اس کے چہرے کا طواف کرتیں' پھر مایوس ہو کر پلٹ آتیں۔ کچھ دیر تک وہ خاموش کھڑا رہا۔ آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ پھر آگے بڑھا۔ کچھ آگے جا کر اس نے سڑک پار کی اور دوسرے فٹ پاتھ پر واپس چلنا شروع کیا۔ نظریں بدستور اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ ایک ایک چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ حالانکہ اپنی اس حرکت کا اسے خود کوئی ادراک نہیں تھا کہ وہ کیا کررہا ہے' کسے تلاش کررہا ہے اور کیوں تلاش کررہا ہے۔ بس ایک خود فراموشی کی کیفیت اس پر طاری تھی۔ اوڈین سینما کے مقابل پہنچ کر وہ پھر رک گیا۔ گہری متجسس نظروں سے اطراف میں آتے جاتے چہروں کو دیکھا لیکن آنکھوں کو ناکامی ہوئی اور تب اس وقت' اتنی دیر میں پہلی بار' اس کے دل میں ایک بے نام سی مایوسی اور افسردگی پھیلتی چلی گئی۔ جیسے وہ کسی امتحان میں فیل ہوگیا ہو۔ اس نے زور سے سانس لی۔ واپس مڑا اور ایک سگریٹ شاپ میں گھس گیا۔

سگریٹ اور ماچس خرید کر باہر نکلا تو یکایک ٹھٹک کر رک گیا۔ ایک چکا چوند سی ہوئی۔ ایک شعلہ سا لپکا۔ پھر بے شمار ستارے دور تک جگمگاتے چلے گئے۔ روشن اور رنگین۔ پھر خوشبو کا ایک جھونکا کہیں سے آیا اور سر سے پاؤں تک اس کے وجود کو سرشار کرتا چلا گیا پھر یکایک اس کی سمجھ میں آگیا کہ اتنی دیر سے وہ کیوں بھٹک رہا تھا۔ کس کے لیے بھٹک رہا تھا اور کیا تلاش کررہا تھا۔ اور جسے وہ تلاش کررہا تھا وہ اب اس کے مقابل آگئی تھی۔

"ارے آپ؟"

"ہاں۔" وہ خفیف ہو کر مسکرایا۔

"یہاں کیا کررہے ہیں؟"

وہ اندر ہی اندر مزید پشیمان ہوا۔ کیا کہے' کیسے بتائے کہ وہ ایک ناشائستہ حرکت کا ارتکاب کررہا تھا۔ کیسے کہے کہ وہ' غیر شعوری طور پر ہی سہی' اسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اگر بتا دے تو وہ کیا سوچے گی۔ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی۔ یقیناً وہ اسے غیر مہذب اور گرا ہوا آدمی سمجھے گی۔ نہیں' وہ اس کی نظروں میں سبک ہونا گوارا نہیں کرسکتا۔ جھوٹ کا سہارا لینا ہی مناسب ہے۔ چنانچہ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ذرا اطمینان سے مسکرایا۔

"ذرا ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔"

"کیا کام پر نہیں گئے؟"

"گیا تھا۔ لیکن طبیعت کچھ ست تھی' لہٰذا جلدی چلا آیا۔"

پھر اس نے ذرا غور سے رقیہ کو دیکھا۔ رقیہ نے گہرے کتھئی رنگ کا چوڑی دار پائجامہ اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ کرتے کے اوپر ایک دبیز سوئٹر تھا۔ سر پر معمول کے مطابق ایک بڑا رومال بندھا تھا۔ جس سے اس کی نصف پیشانی اور گردن چھپ گئی تھی۔ اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح دلکش نظر آرہا تھا۔ ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ بھی موجود تھی۔ مگر اس مسکراہٹ میں خوشی کا شائبہ نہیں تھا۔ چہرے پر اداسی کی پرچھائیں تھی اور.... آنکھوں میں افسردگی اور ملال۔ یہ اداسی اور حزن کی کیفیت علی نے پہلی بار بھی رقیہ کے چہرے پر دیکھی تھی اور دوسری بار بھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے رقیہ اندر ہی اندر ٹوٹ گئی ہے۔ اپنے آپ سے ہار گئی ہے۔ جیسے وہ بے سہارا ہے اور دنیا کی بھیڑ میں گم ہوگئی ہے۔ مگر کیوں؟ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔ اتنے دلکش چہرے پر شکست اور ملال کا سایہ نہیں ہونا چاہیے' اس پر صرف روشنی ہونی چاہیے۔ جگمگاتے ہوئے چاند اور دمکتے ہوئے ستاروں کی ضیا اور پھولوں کے رنگ۔ آخر رقیہ اتنی دکھی کیوں نظر آتی ہے۔ کون سا رنج ہے جو اس نے حرزِ جاں کیا ہے۔ علی چند لمحے رقیہ کے چہرے کو دیکھتا رہا اور اندر ہی اندر اس کے اپنے دل کے آنگنوں میں ایک اداسی اور پژمردگی پھیلتی چلی گئی۔ پھر یکایک اس نے زور سے سانس لی اور رقیہ کے دونوں ہاتھوں میں لٹکے ہوئے تھیلوں کو دیکھا۔

"شاپنگ کی ہے؟"

"ہاں' آج جمعہ ہے نا' آج کے دن میں پوری شاپنگ کرلیتی

ہوں تاکہ ہفتے کے دوران میں کوئی دقت نہ ہو۔"

"مگر یہ تھیلے تو کافی بھاری معلوم ہوتے ہیں۔"

رقیہ ہولے سے مسکرائی "ہیں تو' مگر آج آپ کی مدد کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میرا گھر پیچھے چیڈک اسٹریٹ کے پاس ہی ہے' چلی جاؤں گی۔"

"تو آپ چیڈک اسٹریٹ میں رہتی ہیں؟"

"نہیں' چیڈک اسٹریٹ کے پاس والی گلی میں۔" رقیہ نے کہا۔ "سینما کے عقب میں ہی ہے اور وہ جو سامنے سپر اسٹور دیکھ رہے ہیں نا آپ۔" رقیہ نے رک کر انگلی سے اشارہ کیا "اس اسٹور میں کام کرتی ہوں۔"

"اچھا تو آپ کام بھی کرتی ہیں۔" علی نے ذرا حیرت ظاہر کی۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اب میں بھی اسی اسٹور سے شاپنگ کیا کروں گا۔"

رقیہ ایک بار پھر ہنسی "مگر آپ تو یہاں نہیں رہتے ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ میں ضرورت کی اشیا یہاں سے خرید کر لے جایا کروں گا۔"

رقیہ نے گہری نظروں سے علی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شرارہ سا لپکا۔ ایک پل کے لیے اس کا چہرہ روشن ہوا۔ اس نے کہا "تو صرف میری وجہ سے آپ اس اسٹور میں شاپنگ کریں گے؟"

"ہاں' امید ہے آپ میرے ساتھ کچھ رعایت ضرور کریں گی۔"

رقیہ ہنسنے لگی۔

پھر وہ چلی گئی۔ علی کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر بس اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

آئندہ کچھ دنوں میں چند ایک ملاقاتیں اور ہوئیں۔ اس میں اتفاقات کا کوئی دخل نہیں تھا۔ علی خود ہی بھٹکتا ہوا ٹاؤن سنٹر پہنچ جاتا تھا۔ کوئی انجانا جذبہ تھا جو انگلی تھام کر اسے کشاں کشاں وہاں لے جاتا تھا۔ وہ خواہ مخواہ اسٹور سے دو ایک چیزیں خرید لیتا اور رقیہ سے دو چار باتیں کر لیتا۔ اگر چھٹی کا دن ہوتا اور خوش قسمتی سے رقیہ مل جاتی تو دونوں ٹاؤن سنٹر میں گھومتے پھرتے۔ ایک اسٹور سے دوسرے اسٹور میں۔ کبھی اوپن مارکیٹ میں کسی بنچ پر بیٹھ جاتے اور کچھ دیر باتوں میں گزارتے۔ گو ان کے درمیان تکلف کا کوئی پردہ نہیں تھا۔ پھر بھی رقیہ نے اپنے اور علی کے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھا۔ وہ کبھی اس کے ساتھ سینما نہیں گئی' کبھی پارک نہیں گئی۔ کسی ایسے مقام پر جانے سے ہمیشہ احتراز کیا جہاں تنہائی اور سناٹا ہو۔ حتیٰ کہ ریستوران میں بیٹھ کر علی کے ساتھ چائے پینا بھی اسے پسند نہیں تھا۔ صرف ایک بار علی کے اصرار پر اس نے ایک بھرے پرے اسٹور کے ریستوران میں بیٹھ کر ایک کپ چائے پی تھی۔ اس کے بعد علی نے پھر کبھی اصرار نہیں کیا۔ اسے رقیہ کے جذبات کا احترام بہرحال مقصود تھا۔

علی کو رقیہ کے چہرے پر ہمیشہ ایک اداسی نظر آتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر ٹوٹ گئی ہو۔ ایک دن اس اداسی کا سبب علی پر منکشف ہوا۔ جو کہانی اس نے سنی' وہ المناک تھی' مگر نئی نہیں تھی۔ جب سے برطانیہ آیا تھا' تب سے اب تک اس نے ایسی کئی کہانیاں سنی تھیں۔ فریب' لالچ' خود غرضی اور دغا بازی کی کہانیاں۔ شرافت اور تہذیب سے عاری اور دوسرے کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے والی کہانیاں۔ اسے گمان تک نہیں تھا کہ رقیہ نے اتنے رنج سہے ہوں گے۔ ایسی پُر عذاب قیامتوں سے گزری ہوگی۔ علی کا خیال تھا کہ رقیہ غیر شادی شدہ ہے۔ لیکن پتا چلا کہ اس کی شادی بھی ہوئی تھی اور وہ طلاق کے اذیت ناک مرحلے سے بھی گزری تھی۔ کچھ عرصہ قبل اس کے والدین اس کے لیے ایک جیون ساتھی کی جستجو میں وطن گئے تھے۔ شومیِ قسمت کہ عزیز و اقارب اور واقف کار حلقے میں کوئی بھی مناسب و موزوں لڑکا نہیں ملا۔ مجبوراً انہوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک شناسا بزرگ کی وساطت سے رقیہ کے شوہر شریف اور اس کی بہن سے ملاقات ہوئی۔ پھر دو تین ملاقاتوں کے بعد شریف کی بہن نے اچانک شادی کی تجویز پیش کر دی۔ شریف صورت شکل' صحت اور تعلیم ہر لحاظ سے موزوں تھا۔ چنانچہ ضروری مراحل طے ہوئے اور شادی ہو گئی۔ ویزے کے حصول میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ شریف برطانیہ آیا اور پھر قانون کے مطابق ایک سال کے قیام کے بعد شریف کے پاسپورٹ پر مستقل قیام کی مہر لگ گئی۔ اس وقت تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ رقیہ کے بیان کے مطابق وہ ایک سال شریف نے ایک ذمے دار اور محبت کرنے والے شوہر کی طرح گزارا۔ لیکن مہر لگتے ہی شریف کے طرزِ عمل میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی بیوی کو اخراجات کے لیے رقم دینا بند کر دیا۔ گھر سے غائب رہنا معمول بنا لیا۔ پاسپورٹ پر مہر لگنے سے پہلے رقیہ دنیا کی سب سے حسین' شائستہ' مہذب اور گھر گرہست عورت تھی۔ مہر لگنے کے بعد وہ پھوہڑ' بددماغ' بدزبان اور بے ہودہ عورت ہو گئی۔ چھ ماہ شدید تناؤ' انتشار اور عذاب میں گزرے۔ پھر شریف نے علیحدہ رہائش کا بندوبست کیا۔ اپنا بوریا بستر سمیٹا اور رقیہ کو طلاق دے کر چلا گیا۔

"ارے' طلاق دے دی۔" علی نے سٹ پٹا کر کہا۔

"ہاں۔"

"مگر.... میرا مطلب ہے.... یہ تو عجیب بات ہے۔ آخر کیوں؟"

"وہ شادی شدہ تھا۔" رقیہ کی آواز گہرے کنوئیں سے آئی۔

"شادی شدہ تھا؟" علی نے انتہائی حیرت سے کہا۔

"ہاں۔" رقیہ نے شکستہ آواز میں کہنا شروع کیا "دراصل وہ انگلینڈ آنا چاہتا تھا۔ اسی لیے شادی کی تھی اس نے۔ یہ بات

ناقابلِ یقین لگتی ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ شریف اور اس کے گھر والے بڑی ہوشیاری سے میرے والد کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دراصل....."

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" علی نے الجھ کر جرح کی "کسی نہ کسی کو تو علم ہو گا۔ اس کے پڑوسی' رشتے دار' شناسا۔ کیا کسی نے بھی نہیں بتایا۔"

رقیہ کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی "میں نے ابھی کہا تھا نا کہ یہ بات قطعی ناقابلِ یقین لگتی ہے۔ مگر ہونی جب ہوتی ہے تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتی ہے۔ اس کے پڑوسیوں اور رشتے داروں کو ممکن ہے اس کی شادی کا علم ہو۔ لیکن اس کے شہر جانے اور تحقیق کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔"

"کیا مطلب؟"

رقیہ چند لمحے سوچتی رہی پھر کہنے لگی "شریف ایک چھوٹے سے شہر کا رہنے والا ہے جو ہمارے شہر سے کوئی ڈیڑھ سو میل دور ہے۔ ہمارے شہر میں اس کی بہن اور بہنوئی کی سکونت ہے۔ ان دنوں ملازمت کی وجہ سے شریف بھی اپنی بہن کے پاس ہی مقیم تھا۔ اس کی بیوی اپنے گاؤں میں تھی۔ غالباً اس کا ارادہ یہ تھا کہ رہائش کا بندوبست ہو جائے تو پھر اپنی بیوی کو بلائے گا۔ لیکن اسی دوران میں اس کا رابطہ میرے ابا سے ہوا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جب اسے معلوم ہوا کہ میرے ابا میرے لیے رشتے کی تلاش میں ہیں تو اس نے پورا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے میں اس کی بہن بہنوئی اور دوسرے دو ایک افراد بھی شامل ہو گئے۔ اس کی بہن نے پیغام دیا اور خواہش ظاہر کی کہ شادی جلد از جلد ہو جائے۔ چنانچہ گفت و شنید کے مراحل طے ہوتے ہی ابا نے مجھے فون کیا۔ ان دنوں میں ریشل اکوالٹی کے دفتر میں کام کرتی تھی اور اماں ابا کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ فون ملنے پر میں نے دو ہفتے کی چھٹی لی اور وطن پہنچی۔ شریف کے والد نہیں ہیں لیکن ماں ہیں۔ وہ دو ایک عزیزوں کو ساتھ لے کر آ گئیں۔ اور چونکہ وقت کم تھا اس لیے سادگی سے فوری طور پر نکاح ہو گیا۔ پھر میں واپس آ گئی۔ دراصل....." رقیہ نے رک کر سانس لی "دھوکا ان بزرگ کی وجہ سے ہوا جن کی وساطت سے شریف اور اس کی بہن سے رابطہ ہوا تھا۔ ان سے ہمارے خاندان کے بزرگوں کے پرانے مراسم ہیں اور ابا ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ابا کا خیال تھا کہ وہ ایک مخلص اور نیک آدمی ہیں اور کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جس سے ہمیں ضرر پہنچے۔"

"تو کیا انہیں علم تھا کہ شریف شادی شدہ ہے؟"

"اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔" رقیہ نے کہا "ممکن ہے وہ خود بھی بے خبر رہے ہوں۔"

"لیکن شریف کی ماں اور بہن وغیرہ تو بہرحال اس سازش میں شریک تھیں؟"

"ہاں۔"

علی کا استعجاب ابھی تک کم نہیں ہوا تھا۔ اس نے الجھ کر کہا۔ "مگر بھئی اس کی بیوی' کیا اس نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا؟"

"میرا خیال ہے' اسے اس بات کا علم ہوا ہی نہیں۔ غالباً اسے یہ بتایا گیا تھا کہ شریف کسی قسم کا کورس کرنے لندن جا رہا ہے۔"

علی گم صم بیٹھا رہا۔ اور غیر یقینی نظروں سے رقیہ کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھتا رہا۔ اسے یہ پوری کہانی ہی بے سروپا اور لایعنی محسوس ہو رہی تھی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شادی شدہ آدمی دوسری شادی رچائے اور کسی کو خبر تک نہ ہو۔ مگر نہیں' یہ کہانی بے سروپا ہی سہی' تاہم ناممکن نہیں۔ اس کے علم میں ایسے دو ایک واقعات پہلے بھی آئے تھے جب لڑکے والوں نے لڑکی کے لواحقین کو یا لڑکی کے والدین نے لڑکے والوں کو دھوکا دیا تھا اور بھید پانی سر سے گزرنے کے بعد کھلا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے خاندان میں ایک خاتون کے ساتھ ایسا ہی سانحہ ہوا تھا۔ جس آدمی سے ان کی شادی ہوئی تھی' اس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ تعلیم یافتہ اور کافی بڑی جائداد اور کاروبار کا مالک ہے۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ بالکل جاہل ہے۔ شراب و کباب سے شوق رکھتا ہے اور دوبار کا سزا یافتہ بھی ہے۔ جائداد کے نام پر صرف ایک چھوٹا سا مکان تھا جو اس کے باپ نے بنوایا تھا۔ پھر اسے اپنے ایک دوست کی بہن کا واقعہ بھی یاد آیا۔ دوست کی بہن تعلیم سے بے بہرہ تو خیر تھی ہی' ساتھ ہی دماغی مریض بھی تھی۔ ایک پاؤں میں لنگ بھی تھا۔ کوشش کے باوجود عزیزوں اور واقف کاروں میں اس کے لیے کوئی رشتہ نہیں ملا۔ عمر کھسک کے پچیس سے اوپر ہو گئی۔ پھر اتفاق سے کہیں سے ایک رشتہ آیا۔ لڑکی کے ماں باپ نے لڑکے کے والدین کے سامنے صرف چند منٹ کے لیے لڑکی کی چھوٹی بہن کو پیش کیا۔ وہ بھی اس طرح کہ وہ اسے اچھی طرح دیکھنے پرکھنے نہ پائیں۔ عمر اکیس سال بتائی۔ تعلیم کے باب میں کہا کہ گیارھویں جماعت پاس ہے۔ لڑکی کے عزیزوں نے بھی اس نیت سے کہ لڑکی کا گھر بس جائے' اس جھوٹ میں اس کے گھر والوں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ شادی ہو گئی۔ دراصل اجنبی' انجان لوگوں میں رشتے جوڑنا کبھی کبھی جوئے کی اندھی چال کے مترادف ہوتا ہے۔ تین پکے بھی مل سکتے ہیں اور یہ بھی امکان رہتا ہے کہ کبھی محض جوکر ہی ہاتھ لگے۔ سارا انحصار قسمت پر ہوتا ہے۔ رقیہ کی قسمت نے ساتھ نہیں دیا اور اس کے ہاتھ جوکر آیا۔ جوکر جس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

علی نے چند لمحے بعد کہا "شریف اب کہاں ہے؟ کیا اسی شہر میں رہتا ہے؟"

"نہیں' اب وہ ہڈر سفیلڈ میں رہتا ہے۔ جو یہاں سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر یارکشائر میں ہے۔"

"اور اس کی بیوی؟"

"وہ بھی اس کے پاس ہے۔"

"اچھا' تو وہ یہاں آگئی۔ مگر کیسے؟" علی نے حیرت سے پوچھا۔

رقیہ پژمردگی سے مسکرائی "اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ وہ آخر اس کی بیوی تھی' اسے تو یہاں آنا ہی تھا۔ علیحدگی کے کچھ عرصے بعد وہ وطن گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے' اس نے ایک نیا نکاح نامہ حاصل کیا تھا کیونکہ پرانا استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ پھر ویزا حاصل کیا اور بیوی کو یہاں لے آیا۔"

"کبھی اس کی بیوی سے ملاقات ہوئی؟" علی نے یونہی پوچھا۔

رقیہ نے زہر خند کیا "بھلا اس کی بیوی سے ملاقات کیوں ہونے لگی۔ ہاں' میرا خیال ہے' ایک بار اسے دیکھا ضرور ہے۔ شریف اسے لے کر یہاں کسی دوست کے گھر آیا تھا۔ میں نے ذرا فاصلے سے ان دونوں کو فٹ پاتھ پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

علی کے ذہن کی خلش کم نہیں ہوئی۔ وہ کچھ اور باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا۔ دو ایک سوال اس کے دماغ میں مچل رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ جب شریف بیوی کو انگلستان لانے کی نیت لے کر وطن گیا تھا تو رقیہ یا اس کے والد نے کوئی کارروائی کیوں نہیں کی۔ اگر وہ ایک خط برطانوی ہائی کمیشن کو لکھ دیتے تو شریف مشکل میں پڑ جاتا۔ اس کا نیا نکاح نامہ بے وقعت ہو جاتا اور اس کی بیوی کو ویزا دینے سے انکار کردیا جاتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ شریف کے اوپر دھوکا دہی کے الزام میں مقدمہ بھی دائر کرسکتے تھے۔ شریف نے جس دغابازی اور فریب کا مظاہرہ کیا تھا اس کے جواب میں ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ اسے معاف نہ کیا جاتا۔ لیکن رقیہ اور اس کے والد نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ صبر کرکے بیٹھ رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ نیک طبیعت ہیں اور وہ لوگ جو شریف النفس اور نیک طبع ہوں ان میں برائی کرنے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ مگر علی نے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ ذہن میں کلبلاتے سوالوں کو نظرانداز کردیا کہ انہیں زبان پر لانے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ جو مقدر تھا' ہوچکا تھا۔ جو بازی ہارنا تھی' ہاری جاچکی تھی۔ وہ لمحہ جو ماضی کی گرد میں گم ہوچکا تھا' اب واپس نہیں آسکتا تھا۔ وہ رقیہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا جس پر حزن کی تاریکی گہری ہوگئی تھی۔ وہ اس کی آنکھیں دیکھ رہا تھا جو خلا کی طرح ویران نظر آرہی تھیں۔ وہ زخموں کو کریدنے کے عذاب سے آگاہ تھا۔ اگر وہ سوال پوچھے گا تو رقیہ کے زخموں کو اور کریدے گا۔ اور زخموں کو مزید کریدنے کا مطلب تھا' ٹیسیں' درد اور اذیت۔ اور وہ رقیہ کو مزید آزردہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے مزید کوئی سوال کرنے سے احتراز کیا۔

کچھ دیر بعد اس نے کہا "رقیہ مجھے واقعی رنج ہوا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم نے اتنے صدمے اٹھائے ہوں گے۔ اتنے رنج سہے ہوں گے۔ تمہارے ساتھ قسمت نے واقعی بہت ظلم کیا۔"

رقیہ ہولے سے مسکرائی "تم افسوس مت کرو۔ میرے نصیب میں جو تھا' وہ مجھے ملا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک وقت ایسا تھا' جب ناقدری کے احساس سے میں بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ یہ خیال مجھے رلاتا تھا کہ ایک بدنیت شخص نے محض اس ملک میں آنے کے لیے مجھے استعمال کیا۔ چند ایک بار میں نے خودکشی کے بارے میں بھی سوچا تھا۔ مگر پھر سنبھل گئی۔ زندگی اتنی بے قیمت تو نہیں ہوتی کہ اسے صرف ایک آدمی کی کمینگی کے باعث ضائع کردیا جائے۔ چنانچہ میں نے طے کیا کہ پیچھے نہیں دیکھوں گی' صرف آگے دیکھوں گی۔ میں ڈوبتے ہوئے سورج کو نہیں بلکہ طلوع ہوتے ہوئے سورج کو دیکھوں گی۔ زندگی اگر جینے کے لیے ملی ہے تو میں اسے جیوں گی۔ اور ہرچند کہ میں ابھی تک اپنی مایوسی اور ناقدری کے احساس پر پوری طرح قابو نہیں پاسکی ہوں۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ایک دن میں اس دلآزار سانحے کا نقش پوری طرح اپنے دل سے مٹانے میں کامیاب ہوجاؤں گی۔"

علی نے تحسین آمیز نظروں سے رقیہ کو دیکھا "یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی۔" اس نے کہا "اور مجھے یقین ہے کہ آنے والے کل کے دامن میں تمہارے لیے مزید کوئی رنج نہیں ہوگا۔ بلکہ صرف خوشی ہوگی اور وہ بھی ڈھیر ساری۔"

رقیہ مسکرائی اور علی نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کی مسکراہٹ میں افسردگی کم اور مسرت کی روشنی زیادہ تھی۔

○☆○

پھر ایک دن اچانک علی کو راجا کا خط ملا۔

علی خیر خیریت ... معلوم کرنے کے لیے اکثر بشیر احمد صاحب کو فون کرتا رہتا تھا۔ ایک دن کھانے کی چھٹی کے وقفے میں اس نے پبلک فون بوتھ سے انہیں فون کیا تو انہوں نے دو خبریں اسے سنائیں۔ ایک اچھی' ایک بری۔ بری خبر قربان کے بارے میں تھی۔ قربان راجڑیل چھوڑ کر چارلے چلا گیا تھا اور ایک نیا پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ لیکن اس سے قبل کہ حصول پاسپورٹ کی کوشش بار آور ہوتی' امیگریشن پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔ انہوں نے اسے کہاں اور کیسے گرفتار کیا تھا' یہ بشیر صاحب کو معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ نہ ہی یہ معلوم ہوا کہ انہیں قربان کے چارلے میں روپوش ہونے کی اطلاع کہاں سے اور کیوں کر ملی تھی۔ البتہ یہ اطلاع انہیں مل گئی تھی کہ قربان نے اسائلم کی درخواست دے دی ہے۔ نیز یہ کہ اس کی درخواست منظور ہوگئی ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ اب قانونی کارروائی شروع ہوگی اور فیصلہ ہونے میں کوئی سال ڈیڑھ سال ضرور لگ جائے گا۔

اچھی خبر یہ تھی کہ راجا خیریت سے گھر پہنچ گیا تھا۔ مگر اس اچھی خبر کا ایک افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ راجا کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بشیر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ راجا نے ایک خط علی کو ان کی معرفت بھیجا ہے۔ جو وہ صبح ہی حوالۂ ڈاک کرچکے ہیں۔

بات ختم کرنے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر علی کو بہت محتاط رہنے کی تاکید کی۔

اگلی صبح جب وہ کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا تو خط آگیا۔ اس نے لفافہ جیب میں رکھا اور کام پر چلا گیا۔ علی کا خط آنے کی خبر سن کر جو مسرت اسے ملی تھی' وہ دوپہر میں کھانے کے وقفے کے دوران میں خط پڑھ کر کافور ہو گئی۔ راجا نے لکھا تھا "علی میرے یار' گرفتاری کے بعد جو کچھ وہاں گزری تھی' وہ تو خیر ایک الگ داستان ہے جو غالباً تمہیں بشیر صاحب سے معلوم ہو گئی ہو گی۔ لیکن اصل عذاب اس وقت شروع ہوا جب میں وطن پہنچا۔ کپتان نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ انہوں نے مجھے حوالات میں رکھا اور پھر وہ دلآزار کارروائی شروع ہوئی جس کے تصور سے بھی میرا دل کانپتا ہے۔ کون سا ستم ہے جو انہوں نے مجھ پر نہیں کیا۔ گالی گلوچ' مغلظات اور مار پیٹ اور تحقیر۔ پھر انہوں نے مجھے عدالت میں پیش کیا جو محض ایک برائے نام کارروائی تھی۔ برائے نام یوں کہ میں نے خوف زدہ ہو کر ان کے آگے سپر ڈال دی تھی۔ تم بخوبی جانتے ہو' ہمارے ملک میں کیا ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو قانون کے رکھوالے ہیں' خود ہی قانون کے ساتھ دن رات زنا بالجبر کرتے ہیں اور انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ ان کے لیے ہر بات جائز اور مباح ہے' کیونکہ حرام و حلال کا تصور ان کے لیے ذرا مختلف ہے۔ میں نے دن رات محنت کر کے اور اپنا پیٹ کاٹ کر چار پیسے جوڑے تھے۔ اس رقم کا بڑا حصہ "نذرانے" کے طور پر پیش کرنا پڑا' نہ کرتا تو لمبا عرصہ جیل میں گزرتا۔ لیکن انہیں "خوش" کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ جیل سے جلدی چھٹکارا مل گیا۔ اب ایک دردناک لطیفہ سنو۔ ہاں' میں اسے دردناک لطیفہ ہی کہوں گا۔ جیل سے گھر آنے کے بعد ایک دن میں نے حساب کیا کہ برطانیہ جانے میں کتنی رقم خرچ کی تھی میں نے اور وہاں کل کتنی رقم کمائی۔ پھر کتنی رقم واپسی کے کرائے اور "نذرانے" میں خرچ کی۔ سارا حساب کرنے کے بعد منکشف ہوا کہ مجموعی طور پر مجھے صرف چند ہزار روپے کا فائدہ ہوا۔ ہاں صرف چند ہزار روپے' اب ذرا غور کرو کہ میں نے اتنی پریشانی اٹھائی' خوف و خطرات میں رات دن گزارے' چوہوں کی طرح اپنی جان بچاتا پھرا' پھر کتوں کی طرح شب و روز محنت کی' ڈبے کی سبزی اور جینز کھا کر گزارہ کیا۔ اور یہ سب کچھ میں نے صرف چند ہزار روپے کے لیے کیا۔ ہے نا یہ ایک انتہائی مہمل' مضحکہ خیز' پھیکا اور دردناک لطیفہ۔ تم اس سے زیادہ واہیات لطیفہ کبھی نہیں سنو گے۔ خیر' جو ہونا تھا' سو ہوا۔ ابتدا میں میں بہت مایوس اور دل گرفتہ تھا اور شاید رنجیدہ بھی۔ مگر اب ٹھیک ہوں۔ سوچتا ہوں کہ شاید اس میں میرے لیے کوئی بہتری کا پہلو ہو گا۔ کون جانے اگر میرے نصیب میں یہیں کچھ بہتر لکھا ہے تو مجھے ضرور ملے گا۔ امید ہے تم بخیریت ہو گے۔ میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ دعا کرتا رہوں گا کہ تم اس افتاد سے بچے رہو جس سے مجھے گزرنا پڑا۔ خط ضرور لکھنا اور کبھی وطن آنا تو میرے پاس آنا۔ ہم دونوں کا ساتھ چھوٹا ہے' دوستی ختم نہیں ہوئی۔" علی نے خط ختم کیا اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اداس' لاوارث اور گمشدہ۔ راجا کے خط کی پوری عبارت ایک خوف بن کر اس کے وجود میں اتر گئی تھی۔ اور اس کے دل کو کھنکھجوروں کی طرح اپنے پنجوں سے نوچ رہی تھی۔ راجا نے اپنی نیک خواہشات اس کے لیے بھیجی تھیں۔ لیکن اس کی نیک خواہشات کیا واقعی اس کے کسی کام آئیں گی؟ وہ خود بھی تو راجا کے لیے بہتری کا خواہاں تھا۔ تاہم کیا ہوا؟ اس کی دعاؤں کو عرش تک پہنچنے کا راستہ ہی نہیں ملا۔ راجا کی نیک خواہشات بھی اس کے کسی کام نہ آئیں گی۔ کب تک بچے گا وہ؟ اس کی حالت تو اس مسافر کی سی ہے' جو گھنے' تاریک جنگل میں راستہ بھول گیا ہو اور دیوانہ وار جستجو کے باوجود باہر نکلنے سے قاصر ہو۔ وہ خود بھی بے یقینی کے تاریک جنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ اور حیران ہے کہ باہر نکلے تو کیسے؟ چنانچہ کب تک وہ چھپ چھپ کر رہے گا۔ کب تک قانون کو دھوکا دے گا۔ اس غیر یقینی صورتِ حال کا شاید کوئی اختتام نہیں ہے۔ بدقسمتی سے وہ نیا پاسپورٹ بھی حاصل نہیں کر سکتا؟ سیاسی پناہ کا حصول بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ اس کو تقریباً ایک سال ہونے والا ہے۔ اگر ابتدا ہی میں وہ خود کو قانون کے حوالے کر کے اسائلم کی درخواست دے دیتا تو ضرور بات بن جاتی۔ ٹھیک ہے' اسے مستقل طور پر رہائش کا حق نہیں ملتا۔ لیکن دو تین سال کا وقت تو مل جاتا۔ مگر اب یہ ممکن نہیں۔ اب اگر وہ حکام کے پاس جائے تو پہلا سوال وہ یہی کریں گے کہ وہ اب تک کہاں تھا؟ تو وہ کیا جواب دے گا۔ نہیں' اب وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ تو پھر کیا کرے گا۔ وہ کب تک اس طرح وقت گزارے گا۔ علی گم صم بیٹھا رہا اور سراسیمہ نظروں سے خط کو گھورتا رہا۔

"راجا' تمہارا شکریہ لیکن مجھے ڈر ہے کہ تمہاری نیک خواہشات اور بہترین دعائیں میرے کسی کام نہیں آئیں گی۔"

ان ہی دنوں ایک اور اتفاق ایسا ہوا جس نے علی کو مزید ملول اور ہراساں کیا۔

اس دن اجمل اوور ٹائم کر رہا تھا چنانچہ علی کو گھر جانے کے لیے بس کا سہارا لینا پڑا۔ بس اسٹیشن پر پہنچا تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بس کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ علی نے وینڈنگ مشین میں مطلوبہ سکے ڈال کر ایک کپ کافی حاصل کی پھر ایک بینچ پر بیٹھ کر ہولے ہولے چسکیاں لینے لگا۔ بس اسٹیشن پر خلافِ معمول سناٹا تھا۔ محض چند افراد اِدھر اُدھر بیٹھے بس کا انتظار کر رہے تھے۔ پیپر شاپ کے عقب میں ایک لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ کھڑی تھی۔ ان دونوں کو اپنے گردوپیش کی خبر نہیں تھی کیونکہ ان کے جسم اور ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست اور آنکھیں بند تھیں۔ ایک عورت دائیں جانب بینچ پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھنے میں غرق تھی۔ اس کے پیچھے ایک عمر رسیدہ جوڑا براجمان تھا۔ عورت بڑی

اہمیت کے انداز... میں کچھ کہہ رہی تھی اور مرد بڑے دھیان سے سن رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر مگر خاصا اجاڑ سا آدمی علی کے قریب سے اسے خشمگیں نظروں سے گھورتا ہوا گزرا اور زیرِ لب بڑبڑایا۔

"سن آف اے بچ۔"

علی نے سنی اَن سنی کی۔ ایسے اہانت آمیز فقرے اس نے اکثر سنے تھے۔ باسٹرڈ' بچ اور سن آف اے بچ۔ انگریزوں نے بے شک کبھی تین چوتھائی دنیا پر حکومت کی تھی مگر اب وہ دن نہیں رہے۔ اب بیشتر ممالک ان کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ اس کے باوجود اکثر انگریز ابھی تک نسلی برتری کے خول میں بند ہیں۔ آج بھی وہ تیسری دنیا کے باشندوں کو حقیر اور کمتر جانتے ہیں چنانچہ کوئی رنگ دار یا سیاہ فام باشندہ انہیں نظر آجائے تو ان کے احساسِ برتری کو سخت ٹھیس لگتی ہے اور وہ کوئی نہ کوئی تحقیر آمیز حرکت کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ علی کو شروع میں بہت تکلیف ہوتی تھی۔ شدید توہین کا احساس اس کے خون میں آگ بن کر دوڑنے لگتا تھا اور اس کا دل چاہتا تھا کہ توہین کرنے والے کی گردن دبوچ لے مگر رفتہ رفتہ اس نے سیکھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ کہاں تک وہ لڑے گا اور کس کس سے لڑے گا۔ یہ تو اس ملک میں شب و روز کا معمول ہے۔ بہتر یہی ہے کہ نظرانداز کیا جائے۔ گو آسان نہیں تھا مگر دھیرے دھیرے اس نے سنی اَن سنی کرنے کی عادت ڈال لی۔ اس وقت بھی اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بکتا ہے تو بکنے دو کم بخت' تخمِ ناتحقیق' میرا کیا جاتا ہے۔ اس نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور پیپر کپ ڈسٹ بن میں اچھال دیا۔

تبھی اس کی نظر معاً اس آدمی پر پڑی جو پیپر شاپ کے آگے ایک بینچ پر چپ چاپ گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ سیاہ پتلون اور سیاہ اینوراک پہنے ہوئے تھا۔ سر پر بھورے رنگ کی پگڑی تھی۔ علی کو وہ صورت کچھ پہچانی سی لگی۔ شک گزرا کہ اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے۔ علی کو تجسس نے اکسایا' وہ غیرارادی طور پر اٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس آدمی کے پاس پہنچا۔ ابھی پانچ سات قدم دور ہی تھا کہ معاً اس آدمی نے گردن اٹھائی اور علی کی جانب دیکھا۔ نظریں ملیں' ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے پھر وہ چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے تم؟"

علی کو یکلخت یاد آگیا کہ وہ کون ہے۔ اس نے ایک حیرت آمیز مسرت کے ساتھ کہا "جوگندر ہو نا تم؟"

"ہاں' اور تمہارا نام... ہاں یاد آیا' علی ہے' ہے نا۔"

علی نے گرمجوشی سے جوگندر کا ہاتھ تھاما "ہاں' میں علی ہوں مگر بھائی تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

دونوں پھر بینچ پر بیٹھ گئے۔ جوگندر نے اس کا ہاتھ ہولے سے دبا کر کہا "مانچسٹر جا رہا ہوں۔"

"مانچسٹر؟"

"ہاں' میں اب وہیں رہتا ہوں۔"

"لیکن تم تو شاید لیڈز میں تھے؟"

"ہاں' میں لیڈز میں تھا۔" جوگندر نے ایک بار پھر سر سے پاؤں تک علی کو دیکھا "کوئی سات مہینے وہاں رہا تھا پھر خطرہ بڑھ گیا تو شہر چھوڑنا پڑا۔ پہلے کچھ دن شیفلڈ میں گزارے پھر میں مانچسٹر چلا گیا۔ وہاں میرے گاؤں کا ایک آدمی ہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر بولا "اور سناؤ' تم کیسے ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ اب تک کیا کیا تم نے؟"

گو جوگندر' علی کے ساتھ ہی آیا تھا۔ علی کی طرح وہ بھی غیر قانونی تھا مگر جن حالات میں اس نے وقت گزارا تھا' ان سے اس نے ایک ہی بات سیکھی تھی۔ احتیاط' ناپ تول کر بولنا اور کسی پر پورا بھروسا نہ کرنا۔ چنانچہ حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ کا سہارا لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی پوری آپ بیتی ردوبدل کے ساتھ سنا دی تاہم یہ نہیں بتایا کہ کہاں رہتا ہے اور کیا کام کرتا ہے' اس نے بتایا کہ ایکر ٹگٹن میں رہتا ہے اور فی الحال بیکار ہے۔

"شاید ہم سب کی ایک ہی کہانی ہے۔" جوگندر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "قانون سے بچتے پھرنا اور خوف زدہ رہنا۔"

"ہاں بھائی۔" علی کے لہجے میں تلخی گھل گئی "قانون سے بھاگنا اور خوف زدہ رہنا۔ پتا نہیں یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔"

"مجھے راجا کے بارے میں سن کر افسوس ہوا۔" جوگندر نے افسردگی سے کہا "وہ اچھا آدمی تھا۔ نہ پکڑا جاتا تو کیا حرج تھا مگر شاید ایک دن یہی ہونا تھا۔ ہم سب کے ساتھ یہی ہونا ہے۔ ٹھیک ہے' کچھ لوگ کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتے ہیں اور یہاں اپنی رہائش کو قانونی طور پر جائز بنا لیتے ہیں مگر کتنے لوگ؟ اکثر تو پکڑے ہی جاتے ہیں۔ ہمارا بھی ایک دن شاید یہی انجام ہونا ہے۔ موہن بھی تو واپس چلا گیا۔"

"ارے۔" علی کے ذہن کو یکایک ایک جھٹکا لگا "موہن چلا گیا۔ کب' کیسے؟ کیا وہ بھی پکڑا گیا تھا؟"

"ہاں۔" جوگندر تھکی ہوئی آواز میں بتانے لگا "ہم دونوں الگ الگ ٹھکانوں پر رہتے تھے لیکن ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے تھے۔ ایک دن موہن ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ زخم کافی گہرے تھے۔ لوگوں نے فوری طور پر اسے اسپتال پہنچا دیا۔ اب تم تو جانتے ہو کہ اسپتال میں سیریس کیسوں میں مریض سے تمام تفصیلات پوچھی جاتی ہیں پھر پولیس بھی ضروری انکوائری کرتی ہے۔ موہن کے پاس کون سی تفصیلات تھیں کہ بتاتا چنانچہ سارا بھید کھل گیا۔ موہن نے مان لیا کہ وہ غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہوا ہے لیکن اس نے کسی اور کا نام نہیں لیا پھر اسے مشورہ دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو اسائلم کی درخواست دے سکتا ہے۔ تمہیں حیرت ہوگی کہ یہ مشورہ ایک امیگریشن افسر نے خود ہی اسے دیا تھا مگر موہن نے انکار

کردیا۔ دراصل وہ اتنا دل شکستہ اور پریشان ہوچکا تھا کہ یہاں رہنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مجھ سے اکثر کہتا تھا کب تک میرا خون چوسا جائے گا' کب تک میں ایک ڈیڑھ پاؤنڈ فی گھنٹے پر کام کروں گا اور کب تک قانون سے آنکھ مچولی کھیلوں گا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں واپس چلا جاؤں اور غالباً اسی بنا پر اس نے اسائلم لینے سے انکار کردیا تھا۔ پھر جب علاج کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو پولیس نے اسے واپس بھیج دیا۔"

"تم اس سے ملے تھے؟"

"ہاں۔" جوگندر نے کہا "جب وہ گھر آیا تھا تو دو بار میں اس کے پاس گیا تھا۔"

علی نے طویل سانس لی "یار یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"بھائی کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے۔" جوگندر نے قدرے توقف کے بعد کہا "کہ ہم سے بڑی بھول ہوگئی۔ ہم نے دور سے ایک چمکتی ہوئی چیز دیکھی اور اسے سونا سمجھ کر دوڑ پڑے حالانکہ ہر چمکنے والی شے سونا نہیں ہوتی۔ ویسے یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس ملک میں "سونا" بہت ہے۔ بے شمار ایشین ہیں جو آج بہت خوشحال ہیں مگر وہ لوگ جائز طریقے سے آئے تھے۔ سوال ہم لوگوں کا ہے۔ ہمیں تو کوئی جائز اجرت بھی نہیں دیتا پھر قانون بھی ہماری کھوج میں رہتا ہے۔ یہاں ہمارے لیے سونا چاندی شاید کچھ بھی نہیں۔ صرف ریت ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب ایک لعنت میں گھر گئے ہیں۔"

"لعنت؟"

"ہاں یار۔" جوگندر نے پژمردہ آواز میں کہا۔

علی نے دیکھا' جوگندر کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ اس نے معاً چونک کر کہا "کیا بات ہے جوگندر تم بہت پریشان نظر آرہے ہو؟"

"کیا کروں یار بے بے بیمار ہے۔" جوگندر کی آواز کپکپا گئی۔

"ارے تمہارا مطلب ہے' تمہاری اماں بیمار ہیں؟" علی نے متردد ہو کر پوچھا۔

"ہاں' چٹھی آئی تھی۔" جوگندر نے آہستہ سے کہا "دو ہفتے سے زیادہ ہوگئے۔ بے بے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہاں گاؤں میں کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں۔ ایک بیوہ ماسی ہے' وہی اس کا خیال رکھتی ہے۔ ماسی نے لکھا تھا' بے بے تمہیں دیکھنے کے لئے بے تاب ہے۔ ہر وقت دروازے کو تکتی رہتی ہے۔ جب چٹھی آئی تھی تو میں بہت رویا تھا۔ ایسی لاچاری میں نے کبھی محسوس نہیں کی۔ جاؤں تو کیسے جاؤں کیونکہ میں تو سفر بھی نہیں کرسکتا۔"

"یہ تو واقعی بڑے رنج کی بات ہے۔" علی نے کہا اور محسوس کیا کہ اس کی آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔

"میرے پاس پاسپورٹ تو ہے لیکن اس پر کوئی اندراج نہیں ہے۔ اگر جہاز کا ٹکٹ لینے جاؤں تو ظاہر ہے کہ یہاں یا وہاں پکڑا جاؤں گا۔ کیا کروں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری بے بے بہت اچھی ہے۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں.... میں بے موت مرجاؤں گا۔"

"نہیں بھائی' ایسا مت کہو۔" علی نے جوگندر کے شانے پر تھپکی دے کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "تمہاری اماں ضرور اچھی ہوجائیں گی۔ مجھے پوری امید ہے' بھروسا رکھو۔"

جوگندر نے چند لمحے بعد زور سے سانس لی پھر پژمردہ آواز میں بولا "ہم سب ایک لعنت میں مبتلا ہیں اور اس کے ذمے دار بھی ہم خود ہی ہیں۔ پتا نہیں ابھی اور کیا کیا دیکھنا باقی ہے۔"

علی نے کچھ نہیں کہا۔ جوگندر بھی خاموش رہا۔ دونوں اپنے اپنے خیالات کے حصار میں قید تھے۔ علی کو اندازہ نہیں تھا کہ جوگندر کیا سوچ رہا ہے لیکن خود اس کا ذہن گہرے اضطراب اور اَن گنت وسوسوں میں گھر گیا تھا۔ اس کی بھی تو اماں ہیں اور بہن اور بھائی۔ اس نے ان ہی کے لیے تو سفر کی صعوبتیں جھیلی ہیں۔ اب اگر اسے بھی ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے' یعنی خدا نہ کرے' اماں کی طبیعت ناساز ہوجائے یا بہن کی شادی طے ہوجائے یا کوئی اور اہم ضرورت پڑ جائے تو وہ کیا کرے گا۔ کیسے واپس جائے گا۔ نہیں' ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کرے اس کی ماں اچھی رہیں مگر یہ نامسعود سوال بہرحال موجود رہے گا کہ اگر واپس جانے کا مرحلہ درپیش ہو تو وہ کیا کرے گا۔ دوسرے لوگ جو ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں' وہ کیا کرتے ہیں؟ گزشتہ کچھ عرصے میں علی نے کافی چھان بین کی اور تحقیق کی تھی' یہ جاننے کے لیے کہ جو لوگ غیر قانونی طور پر آتے ہیں' وہ اپنا مسئلہ حل کرنے کے لیے کیا اقدامات کرتے ہیں۔ اس کے علم میں کئی صورتیں آئی تھیں۔ نیا پاسپورٹ' انشورنس کارڈ کا حصول' شادی اور اسائلم وغیرہ لیکن ان میں سے کوئی بھی طریقہ اس کی دسترس میں نہیں تھا۔ گویا اس کے لیے نجات کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ تو پھر وہ کیا کرے گا؟ کیسے اپنے عدم کو وجود میں تبدیل کرے گا؟ علی جیسے جیسے سوچتا گیا' اس کے دل کا خوف ویسے ویسے بڑھتا گیا۔ بڑھتا ہی گیا۔

○☆○

پھر ایک دن اس کی ملاقات رقیہ کے والد سے ہوئی۔

یہ ملاقات محض اتفاقیہ تھی۔ اس دن چھٹی ذرا جلدی ہوگئی تھی۔ وہ لپکتا جھپکتا ٹاؤن سنٹر پہنچا پھر بس اسٹیشن کی طرف جا ہی رہا تھا کہ معاً رقیہ سامنے آگئی۔ اس کے ساتھ اس کے والد بھی تھے۔ رقیہ نے اسے سلام کیا پھر بغیر کسی جھجک یا تکلف کے اس کا تعارف اپنے والد سے کرایا۔ اس نے ادب سے انہیں سلام کیا۔

"اچھا تو آپ ہی علی صاحب ہیں۔" رقیہ کے والد نے اس کا ہاتھ تھام کر گرم جوشی سے کہا "رقیہ نے ایک بار ذکر کیا تھا کہ آپ نے اس کی مدد کی تھی۔"

وہ ذرا جھینپ کر مسکرایا "ارے نہیں' وہ تو معمولی سی بات تھی۔ میں نے ان کے تھیلے ٹیکسی اسٹینڈ تک پہنچائے تھے اور بس۔"

"بہرحال آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" انہوں نے کہا "آپ کسی دن گھر کیوں نہیں تشریف لاتے؟"

"جی۔" علی نے سٹ پٹا کر کہا "گھر؟"

"ارے بھئی' اس میں اس قدر حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ہم زبان ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ شاید میرے ہی علاقے سے تعلق بھی رکھتے ہیں۔ اب یہاں ہم زبان اور ہم وطن تو ملتے نہیں۔ اگر آپ آئیں گے تو اچھا رہے گا۔ ذرا کچھ اپنی زبان میں تبادلۂ خیال ہو گا۔"

علی نے سٹ پٹائی نظروں سے رقیہ کی طرف دیکھا تو اس نے خوش دلی سے کہا "ہاں آیئے نا۔ اماں بھی آپ سے مل کر خوش ہوں گی۔"

"اچھی بات ہے' کسی دن حاضر ہوں گا۔" آخر اس نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

رقیہ کے والد کا نام نبی احمد تھا۔ برسوں تک مقامی کونسل میں کام کرنے کے بعد حال ہی میں ریٹائر ہوئے تھے اور اب اپنا وقت مطالعے اور باغبانی میں گزارتے تھے۔ باہر جاتے تو کوٹ' پتلون اور ٹائی کا اہتمام کرتے لیکن گھر میں ہوتے تو کرتہ پجامہ پہنے رہتے۔ برسوں انگلستان میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنی مشرقی خو بو نہیں چھوڑی تھی۔ گھر کا ماحول حد درجہ مشرقی تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے ایک کمرا بالکل مشرقی طرز پر آراستہ کیا تھا۔ ایک اوسط سائز کا تخت بنوایا تھا۔ تخت پر ایک گدا اور چاندنی بچھی رہتی' سرہانے گاؤ تکیہ بھی لگا رہتا۔ ایک حقہ بھی تھا۔ جس کی نے کوئی آٹھ فٹ لمبی تھی۔ یہ حقہ انہوں نے بطور خاص وطن سے منگوایا تھا۔ تمباکو کے حصول میں اکثر انہیں پریشانی ہوتی تھی۔ کبھی وطن سے منگواتے اور کبھی بریڈ فورڈ سے۔ اگر کبھی تمباکو نہ ہوتا تو انہیں سخت بے لطفی کا احساس رہتا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک ٹیبل تھی جس پر ایک صراحی دھری رہتی۔ ہر شام رقیہ صراحی کو دھوتی اور اس میں پانی بھرتی۔ نبی احمد اور ان کی بیوی فریج یا نل کا پانی شاذ ہی پیتے تھے۔ انہیں صرف صراحی کا پانی پسند تھا۔ تخت کے قریب قالین کے اوپر ایک چٹائی بھی بچھی رہتی۔ کبھی کبھی نبی احمد وہیں کھانا کھاتے تھے۔ دیواروں پر طغرے آویزاں تھے۔ ایک اگردان بھی تھا جس میں ہر جمعے کو چار چھ اگربتیاں ضرور جلائی جاتیں۔ ان کی خوشبو پھیلتی تو سارا کمرا مہک اٹھتا۔

علی نے کمرے میں قدم رکھا اور حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ تخت' چاندنی' گاؤ تکیے اور صراحی اور طغرے پھر حیرت سے بولا "ارے... یہ کمرا تو خوب آراستہ کیا ہے آپ نے۔ بالکل مشرقی' یوں لگتا ہے جیسے اپنے ہی گاؤں کے کسی گھر میں پہنچ گئے ہوں۔"

"ہاں میاں' یہ میرا شوق ہے۔" نبی احمد نے مسکرا کر خوش خلقی سے کہا۔

"بہت خوب صورت سجاوٹ ہے۔" علی نے تعریفی لہجے میں کہا اور ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا "میں نے ایسا کمرا انگلستان میں تو کہیں نہیں دیکھا۔"

نبی احمد تعریف سن کر خوش ہوئے پھر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "بیٹھو۔"

وہ تخت پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

نبی احمد گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھے۔ حقہ تازہ تھا۔ انہوں نے کش لیا پھر کہنے لگے "میاں کیا کروں' برسوں سے اس ملک میں ہوں لیکن ذہنی طور پر اپنے گاؤں میں ہی رہتا ہوں۔ کبھی وہاں سے نکل نہیں پایا' اسی لیے اس کمرے کو اس ڈھنگ سے آراستہ کیا ہے۔ جب یہاں بیٹھتا ہوں تو اچھا لگتا ہے۔ دل کو ایک ناقابلِ بیان راحت اور آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ وطن کا مسئلہ بھی میاں بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ وطن سے نکلتے ہیں تو پھر مڑ کر نہیں دیکھتے۔ اپنی جنم بھومی کا ہر نقش دل سے مٹا ڈالتے ہیں اور انہیں کبھی کسی کمی یا محرومی کا احساس نہیں ہوتا جبکہ کچھ لوگ وطن چھوڑتے ہیں تو خاکِ وطن کی خوشبو ہمیشہ ان کا پیچھا کرتی ہے۔ میں ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہوں۔"

اتنے میں ان کی بیگم آگئیں۔ رقیہ بھی ساتھ میں تھی اور ایک ٹرے' جس میں ناشتے کے لوازمات قرینے سے آراستہ تھے۔ سموسے' دال سیو' بسکٹ اور چائے۔ اس نے ادب سے رقیہ کی اماں کو سلام کیا اور انہوں نے مسکرا کر دعا دی پھر کہنے لگیں۔

"لو بھیا' چائے پیو۔"

"لیکن آپ نے اتنا تکلف کیوں کیا' صرف ایک چائے کافی تھی۔" اس نے ذرا جھینپ کر رسماً کہا۔

"ارے بھیا' تکلف کیا' دو چار سموسے ہی تو ہیں۔ اب خالی خولی چائے تو اچھی نہیں لگتی نا۔"

دو چار اور باتیں کر کے اور اس کے لیے ایک کپ چائے بنا کر رقیہ اور اس کی اماں چلی گئیں تو نبی احمد نے کہا "میاں ذرا آرام سے بیٹھو' چائے پیو اور باتیں کرو۔ بہت دن سے اپنی طرف کا لہجہ سننے کو نہیں ملا۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" اس نے چائے سپ کی "یہاں بھانت بھانت کے لوگ ملتے ہیں لیکن اپنی طرف کا کوئی شاذ ہی ملتا ہے اور اگر کوئی مل جائے تو واقعی خوشی ہوتی ہے۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔ کب یہاں آئے تھے؟ کیا کرتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔" نبی احمد نے پوچھا۔

علی کو معاً یاد آیا اس نے رقیہ سے کہا تھا کہ وہ جرمنی سے آیا ہے۔ چنانچہ اس نے اطمینان اور اعتماد سے جھوٹ بولنا شروع کر دیا

"اصل میں، میں جرمنی میں تھا۔ کئی سال سے وہاں ہوں۔ یہاں ایک دوست کے بلاوے پر آیا تھا۔ اس کا منشا تھا کہ میں یہیں رہوں۔ ابتدا میں تو میرا ایسا خیال نہیں تھا مگر اب یہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ جرمنی میں زبان کا بڑا مسئلہ تھا۔ یہاں یہ مشکل نہیں ہے پھر یہ بھی کہ یہاں ایک اچھی ملازمت بھی مل گئی ہے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ جرمنی کے مقابلے میں یہاں حالات بھی قدرے بہتر ہیں۔" نبی احمد نے کہا "رہتے کہاں ہو؟"

"ایکر نگٹن میں۔"

"اپنا مکان ہے؟"

"نہیں، کرائے کا ہے لیکن میرا خیال ہے میں جلدی ہی اپنا مکان خرید لوں گا۔"

نبی احمد نے حقے کا کش لیا پھر بولے "ضرور خریدنا، اپنا مکان ہو تو کئی طرح کے فائدے ہوتے ہیں۔" رکے، پھر مسکرا کر پوچھا۔ "بھئی علی میاں، تمہارا لہجہ اور تلفظ تو بالکل اپنی طرف کا ہے۔ کہاں کے رہنے والے ہو تم؟"

اس نے اپنے شہر کا نام لیا تو نبی احمد نے کہا "نہیں، میرا مطلب ہے کہ وطنِ مالوف کہاں ہے؟"

اس نے اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ نبی احمد یکایک چونک کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ حیرت سے بولے "ارے تم وہاں کے رہنے والے ہو۔ کیا واقعی؟"

علی بھی قدرے متعجب ہوا پھر کہنے لگا "دیکھئے میں تو شہر میں پیدا ہوا تھا لیکن میرا خاندان اسی گاؤں کا ہے۔ والد صاحب لڑکپن میں وہاں رہتے تھے۔ میں خود بچپن میں دوبار کچھ دن کے لیے وہاں گیا تھا۔ نہر کے کنارے، آموں کے باغ کے قریب جو محلہ ہے، اس میں ہمارا گھر تھا مگر آپ اتنے متعجب کیوں ہو رہے ہیں؟"

"ارے بھئی ہم بھی تو وہیں کے رہنے والے ہیں۔" نبی احمد نے ایک جوش آمیز مسرت سے کہا "تو نہر کے کنارے جو باغ تھا اس کے قریب گھر تھا تمہارا؟"

"ہاں، وہ باغ ہمارا ہی تھا۔" علی نے جواب دیا۔ یہ جان کر اس کی حیرت دوچند ہوگئی تھی کہ نبی احمد بھی اسی کے گاؤں کے رہنے والے تھے۔

"وہ باغ تمہارا تھا۔" نبی احمد نے خود کلامی کے انداز میں دہرایا پھر چونک کر بولے "کہیں تمہارے دادا کا نام راغب علی تو نہیں تھا۔"

اب علی کے چونکنے اور سٹ پٹانے کی باری تھی۔ اس نے استعجاب آمیز نظروں سے نبی احمد کو دیکھا "ہاں، ان کا نام راغب علی تھا۔"

"تو پھر تمہارے والد کا نام یقیناً ثاقب علی ہوگا، ہے نا؟"

علی کے ہونٹوں پر ایک اچنبھے سے بھری ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی "ہاں، تھا مگر آپ کو کیسے علم ہوا؟"

لیکن نبی احمد نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ انھوں نے حقہ ایک طرف رکھا اور زور سے چلّائے "ارے بھئی، کہاں ہیں آپ! جلدی آیئے اور رقیہ بیٹا، تم بھی آؤ۔"

پہلی آواز پر جواب نہیں ملا تو انہوں نے دوسری بار آواز دی۔ علی سٹ پٹایا ہوا بیٹھا تھا اور حیرت سے نبی احمد کو گھور رہا تھا۔ کوئی دو منٹ بعد قدموں کی آواز سنائی دی پھر دروازے کی جھالر ہلی اور دونوں ماں بیٹی بوکھلائی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

"کیا بات ہے بھئی، کیا ہوا، خیریت تو ہے؟"

"ارے بھئی دیکھئے تو، کیا عجیب اتفاق ہے۔" نبی احمد نے پُرجوش لہجے میں کہا "یہ علی میاں جو ہیں نا، یہ تمہاری بچپن کی دوست شائستہ کے بیٹے ہیں۔"

رقیہ کی اماں کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گزر گیا۔ چند لمحے وہ گومگو کی حالت میں کھڑی رہیں اور علی کو تجسس آمیز نظروں سے گھورتی رہیں۔ ان کے بشرے سے صاف عیاں تھا کہ الجھن میں مبتلا ہیں اور بیتے دنوں کی یاد کے آوارہ پرندے کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ پھر معاً چونکیں جیسے خواب سے جاگی ہوں اور تحیر زدہ آواز میں زور سے بولیں "ارے بھیا تم شائستہ کے بیٹے ہو؟"

اپنی اماں کا نام ان کی زبان سے سن کر علی کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ اگر شک و شبے کا کوئی شائبہ کہیں تھا بھی تو اب نہیں رہا۔ رقیہ کے اماں ابا اس کے ماں باپ اور دادا کے نام سے واقف تھے۔ یہ ایسا عجیب اتفاق تھا کہ اس کا ذہن تتر بتر ہو کر رہ گیا۔ اسے تو کبھی خواب میں بھی گمان نہیں گزرا تھا کہ وطن سے ہزاروں میل دور انگلستان میں ایسے افراد مل جائیں گے جو اس کے اماں ابا دونوں سے واقف ہوں گے۔ چند لمحے وہ گُم سُم سا بیٹھا رہا اور غیر یقینی نظروں سے کبھی نبی احمد اور کبھی ان کی بیگم کو دیکھتا رہا پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "جی ہاں۔"

کچھ دیر کے لیے سکوت نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ تذبذب ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ جیسے طے نہ کر پا رہے ہوں کہ کیا کہیں اور کیسے کہیں۔ یا تو مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے یا زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی پھر رقیہ نے آخرکار لب کھولے۔

"اماں، کیا آپ علی صاحب کی اماں کو جانتی ہیں؟"

رقیہ کی ماں نے معاً زور سے سانس لی پھر ان کی آواز سنائی دی جو جذباتی انتشار سے لرز رہی تھی "ہاں، اگرچہ شائستہ مجھ سے عمر میں کچھ بڑی تھی پھر بھی ہم دونوں میں کافی ربط تھا۔ کچھ عرصے گاؤں کے مدرسے میں تعلیم بھی ایک ساتھ حاصل کی تھی۔ علی میاں کے والد ثاقب علی بھی اس مدرسے میں پڑھتے تھے۔ نہر کے کنارے علی میاں کے دادا کا آموں کا باغ تھا اور وہیں قریب ہی ہم سب کے گھر تھے۔ بہت خوب صورت دن تھے وہ، خوابوں کی طرح مگر پھر حالات بدلے۔ یہ لوگ چلے گئے۔ بچپن کی بات تھی لہٰذا کوئی رابطہ بھی نہیں رہا۔ کبھی کبھی خیر خیریت مل جاتی تھی پھر وہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا

کیونکہ شادی کے بعد ہم لوگوں نے نہ صرف گاؤں چھوڑا اور شہر کا رخ کیا بلکہ کچھ عرصے بعد ملک ہی چھوڑ دیا۔" وہ یکایک رکیں' شفقت سے علی کو دیکھا پھر اضافہ کیا "بھیا' سچ سچ اس وقت بے اندازہ خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔ میری بچپن کی سہیلی کے بیٹے ہو۔ مجھے اکثر شائستہ کا خیال آتا تھا اور میں سوچتی تھی' پتا نہیں کہاں ہوگی وہ' کس حال میں ہوگی۔ تمہاری اماں اچھی تو ہیں نا؟"

"جی ہاں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اور تمہارے ابا.... ثاقب علی۔"

"جی' وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں؟" اس کی آواز اور بھی پست ہوگئی۔

"ارے' کیا کہہ رہے ہو میاں۔" نبی احمد نے گھبرا کر کہا "ثاقب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یہ کیسے' کب ہوا؟"

"کئی سال ہوگئے ہیں۔" اس نے افسردہ آواز میں کہا "اچھے بھلے دفتر گئے تھے۔ وہیں طبیعت بگڑ گئی۔ اسپتال پہنچایا گیا مگر....." وہ یکایک چپ ہوگیا۔

"یہ تو بڑے رنج کی بات ہے۔ ان کی ابھی ایسی عمر بھی نہیں تھی۔" نبی احمد نے مدھم لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔" علی نے آہستہ سے کہا "ان کی رحلت کا سانحہ ہم لوگوں کے لیے ایک قیامت سے کم نہیں تھا مگر کیا کیا جائے۔ جو اللہ کو منظور ہو' وہی ہوتا ہے۔ انہیں جتنی زندگی ملی تھی' گزار کر چلے گئے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو میاں۔" نبی احمد نے افسردگی سے سانس لی "سب کچھ اسی کی مرضی سے ہوتا ہے۔ انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔"

"تمہاری اماں تو بالکل ہی ٹوٹ گئی ہوں گی۔" رقیہ کی اماں نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

"جی ہاں' شروع میں تو وہ واقعی بالکل ٹوٹ گئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں زندگی سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ مگر وہ بہت ذمے دار اور حوصلہ مند ہیں۔ انہوں نے اپنے پانچ بچوں کو دیکھا اور حالات سے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ان ہی کی شبانہ روز جدوجہد اور قربانیوں کا صلہ ہے کہ ہم بہن بھائی بکھرنے اور ٹوٹنے سے بچ گئے۔"

"اچھا تو تم پانچ بہن بھائی ہو؟" رقیہ کی ماں نے نرمی سے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"کچھ اپنے گھر کے بارے میں بتاؤ۔۔۔ اپنی اماں اور بھائی بہنوں کے بارے میں۔ کسی کی شادی ہوئی ہے یا نہیں اور کاروبار وغیرہ۔ وہاں گاؤں میں تو خیر زراعت کرتے تھے۔ اب کیا کاروبار ہے؟"

علی کا دل معاً خوف سے کانپا۔ اس نے سہم کر رقیہ' اس کی ماں اور نبی احمد کو دیکھا اور بے کسی سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اب کیا کہے' کیسے کہے کہ وہ باغ خزاں کی نذر ہوگیا جس میں آسودگی اور خوشی کی فصل لگتی تھی۔ برسوں سے ان کے آنگنِ حیات میں بہار نہیں آئی۔ برسوں سے وہ عسرت اور محرومی اور بے یقینی کی فصل کاٹ رہے ہیں۔ کیسے کہے کہ ابا کے مرنے کے بعد اسے صرف اس لیے اسکول چھوڑنا پڑا تھا کہ روٹی کے حصول میں اپنی اماں کا ہاتھ بٹا سکے۔ کیسے بتائے کہ برسوں اس نے ایک فیکٹری میں کام کیا ہے اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے ترسا ہے۔ وہ چاہے بھی تو نہیں بتا سکتا کہ اپنے حالات کی بدولت اور کچھ دوسرے اسباب کی بنا پر وہ غیر قانونی طور پر اس ملک میں آیا ہے اور بہت معمولی اجرت پر ایک فیکٹری میں غلاموں کی طرح کام کرتا ہے۔ نہیں' وہ یہ سب کچھ نہیں بتا سکتا۔ وہ تو سر سے پاؤں تک ایک جھوٹ ہے۔ سچ کا اس کی دنیا میں گزر نہیں۔ گو اس کی زبان ترستی ہے' دل ترستا ہے اور روح بے قرار ہوتی ہے کہ سچ بولے۔ کبھی' کسی وقت' کسی ایک لمحے میں سچ اپنے ہونٹوں سے ادا کرے اور سچ کے نشے سے سرشار ہو۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ جب سے اس ملک میں آیا ہے' جھوٹ بولتا رہا ہے اور اس وقت بھی سچ بولنے کا یارا اس میں نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے حد درجہ بے کسی سے رقیہ کی اماں کی طرف دیکھا اور ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"جی ہاں' سب اچھے ہیں۔ ابھی کسی کی شادی نہیں ہوئی لیکن ایک بہن کی شادی جلد ہی ہونے والی ہے۔ ایک چھوٹا بھائی ہے' وہ عنقریب یونیورسٹی جائے گا۔" پھر وہ یکایک چپ ہوگیا۔

"وہ بھی کیا دن تھے میاں۔" نبی احمد مدھم آواز میں بولے۔ "ہم سب گاؤں میں رہتے تھے اور اس طرح کہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے جیسے ایک گھنا سرسبز پیڑ ہو۔ نہ کوئی غم تھا' نہ کوئی فکر' نہ خوف۔ زندگی اتنی ہی دلکش تھی' جتنی ہونی چاہیے مگر دھیرے دھیرے وہ گھنا پیڑ اجڑ گیا۔ پتے بکھر گئے۔ تمہارے دادا نے وطن چھوڑا۔ خود ہم لوگوں نے بھی شہر کا رخ کیا پھر رفتہ رفتہ وقت کا مزاج ہی بدل گیا۔ دلوں کے فاصلے بڑھے' سکون رخصت ہوا' لوگ اپنی جڑوں سے اکھڑ گئے پھر انتشار' تخریب' فساد' کلاشنکوف اور بموں کی روایت پڑی اور....." نبی احمد بولتے رہے۔ ان کی مدھم آواز کی افسردہ گونج کمرے کی دیواروں سے ٹکراتی رہی اور وہ خاموش بیٹھا زخمی نظروں سے دریچے سے باہر دور تک پھیلے سیاہ بادلوں کو دیکھتا رہا۔

O☆O

جب آیا تھا تو شدید سردی کا موسم تھا۔ اب ایک بار پھر وہی شدید سردی تھی۔ یخ بستہ صبحیں اور برفاب شامیں۔ علی کو اکثر تعجب ہوتا' دیکھتے دیکھتے تقریباً ایک سال گزر گیا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو ایک ایک پل بھاری تھا جبکہ دوسری طرف اتنا وقت گزر گیا اور احساس تک نہیں ہوا۔ تقریباً ایک سال' بارہ

مہینے۔ وہ بارہ ماہ سے اس ملک میں ہے اور اب تک قانون کی دسترس سے محفوظ ہے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اس نے بارہ مہینے اس ملک میں گزار لیے ہیں۔ گو چھپ چھپ کر' جھوٹ کی چادر اوڑھ کر' اپنی ذات کے خول میں سمٹ کر' مگر بہرحال گزار لیے حالانکہ اور کئی لوگوں کو اتنا موقع نہیں ملا۔ راجا پکڑا گیا۔ موہن بھی قانون سے نہیں بچ سکا۔ چند دن قبل اسے اطلاع ملی تھی کہ سلیم خاں بھی واپس چلا گیا۔ اس کے اسائلم کے کیس کی تازہ سماعت میں فیصلہ اس کے خلاف ہوا اور پھر پولیس نے اسے جہاز میں بٹھادیا۔ وہ امینہ سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر اتنا موقع ہی اسے نہیں ملا پھر قربان بھی پولیس کی دسترس سے زیادہ دن نہیں بچ سکا۔ پکڑا گیا اور اب اسائلم پر ہے۔ جب وہ ان باتوں پر غور کرتا تھا تو اس کی حیرت دوچند ہوجاتی تھی کہ وہ اب تک بچا ہوا ہے مگر ساتھ ہی وہ خوف جو اس کے ساتھ سائے کی طرح رہتا تھا' مزید بڑھ جاتا۔ آخر کب تک وہ بچے گا' کب تک قانون سے آنکھ مچولی کھیلے گا۔ ساری عمر تو اس طرح نہیں رہ سکتا تو پھر کیا کرے' کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس سے پہلے کہ قانون کا لمبا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچے' اسے کوئی نہ کوئی تدبیر کرنی ہوگی۔ یا تو انشورنس کارڈ حاصل کرے یا پاسپورٹ اور یا پھر اسائلم کی درخواست دے دے۔ لیکن وہ کچھ بھی طے نہ کرپاتا۔ ایک تذبذب گھیرے رہتا۔ اسے چھان بین کرنے کے بعد اتنا معلوم ہوگیا تھا کہ انشورنس کارڈ یا پاسپورٹ کا حصول ممکن تو ہے لیکن ان دونوں صورتوں پر عمل کرنے کے لیے جو رقم درکار ہے' وہ اس کے پاس نہیں ہے۔ رہ گئی اسائلم کی بات تو اس کی کامیابی کی ضمانت نہیں۔ جلد یا بدیر اسے انجام کار واپس ہی جانا پڑے گا۔

لیکن پریشانی صرف یہ نہیں تھی' ایک اور الجھن درپیش تھی۔ رقیہ..... وہ اکثر رقیہ کے گھر جاتا تھا۔ وہاں بیٹھ کر اور رقیہ کی ماں اور نبی احمد سے باتیں کرکے اسے ایک ایسی آسودگی اور مسرت کا احساس ہوتا جس کا ادراک اسے انگلستان میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یوں لگتا جیسے وہ اپنے ہی گھر میں اپنی ہی اماں کے سامنے بیٹھا ہوا ہے پھر اس کی نظر رقیہ پر پڑتی۔ اس کا صبیح چہرہ' اس کی خواب دیکھتی غلافی آنکھیں اور اس کی شخصیت کی پُرکار سادگی۔ علی کے دل میں گلاب کھلتے چلے جاتے۔ سرخ' نارنجی' سفید اور گلابی اور ان کے دمکتے رنگوں سے اس کے دل کی تاریک دنیا یکایک روشن ہوجاتی۔

رقیہ..... رقیہ!

علی نے کبھی دل نہیں لگایا تھا۔ اوّل تو اس لیے کہ اسے اتنی فرصت ہی نہیں ملی تھی اور دوم اس بنا پر کہ اس کے تصور کے نگار خانے میں جو ایک عورت سجی ہوئی تھی وہ اسے کبھی ملی ہی نہیں تھی۔ ایک لے دے کے سکینہ تھی جسے وہ کبھی کبھی نظر بھر کے دیکھ لیا کرتا تھا۔ سکینہ اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ سانولا رنگ تھا' واجبی سا ناک نقشہ۔ اردو پڑھ لکھ لیتی تھی۔ مجموعی طور پر اس کے سراپا میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ کوئی بھی مرد اس پر اپنے دل و جان نچھاور کرے۔ علی نے بھی کبھی اسے التفات کی نظر سے نہیں دیکھا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ سکینہ اس کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے۔ اس کا چہرہ' اس کی آنکھیں اور جسم کا انگ انگ اس وارفتگی کا اظہار کرتا تھا جو اس کے من میں علی کے لیے تھی۔ گو علی کبھی بھی خود کو اس کی جانب مائل نہیں کرسکا تھا مگر اس کے دل میں سکینہ کے لیے ایک ہمدردانہ جذبہ ضرور تھا۔ اس نے تقریباً طے کر رکھا تھا کہ وہ سکینہ کا دل نہیں توڑے گا۔ اس نے خود تو کبھی کسی سے دل نہیں لگایا اور نہ ہی اسے کبھی اتنی فرصت ملے گی کہ وہ اپنے من میں بسی عورت کو ڈھونڈتا پھرے لہٰذا کیا فرق پڑے گا۔ اگر وہ سکینہ کا دل آباد کردے۔ ایک شادی ہی تو کرنا ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے ایک شریکِ سفر ہی کی تو ضرورت ہے تو پھر کیا حرج ہے اگر وہ سکینہ کا ہاتھ تھام لے۔ سکینہ حسین و طرحدار نہ سہی مگر اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک گھر گرہست اور دکھ درد میں ہاتھ بٹانے والی لڑکی میں ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ بات خود بخود تقریباً طے ہوگئی تھی کہ جونہی مناسب وقت آئے گا' وہ سکینہ سے شادی کرلے گا۔ مگر پھر حالات کے بھنور میں پھنس کر وہ برطانیہ پہنچا اور اس کی ملاقات رقیہ سے ہوئی اور دھیرے دھیرے بالکل غیر محسوس طور پر وہ اس کے دل و دماغ پر چھاگئی۔

رقیہ..... رقیہ.....!

تاہم اگر بات اتنی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی مگر یوں ہوا کہ رفتہ رفتہ اس نے جانا کہ رقیہ کے دل میں بھی اس کے لیے نرم گوشہ ہے۔ وہ محسوس کرتا کہ جب وہ رقیہ کے ساتھ ہوتا ہے تو رقیہ خوش نظر آتی ہے۔ اس کے چہرے کی افسردگی اور آنکھوں کی ویرانی معدوم ہوجاتی ہے۔ اسے صاف محسوس ہوتا کہ رقیہ اس سے ملنا اور باتیں کرنا پسند کرتی ہے۔ اگر کسی بوجوہ ہفتے عشرے کا وقفہ پڑ جائے تو شکوہ کرتی ہے کہ وہ کہاں تھا۔ ملاقات کیوں نہیں کی؟ سب خیریت تو ہے؟ علی کو اس کا متردد ہونا اچھا لگتا۔ ایک مسرت کا احساس ہوتا۔ آدمی صرف یہی نہیں چاہتا کہ وہ کسی کو چاہے بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اسے چاہا جائے۔ چاہے جانے کا اپنا ایک نشہ ہے' ایک لذت ہے۔ کسی کے لبوں پر اس کا نام ہو' کسی کا دل اس کے لیے دھڑکے اور کسی کی چشمِ انتظار اس کی راہ دیکھے۔ یہ احساس بڑا انمول ہوتا ہے کہ یہ احساس روح کو کیف و نشاط اور دل کو جوش' طمانیت اور افتخار کے نشے سے چور چور کردیتا ہے۔ آدمی کی قدر و قیمت اس کی نظروں میں بڑھ جاتی ہے۔ علی بھی رقیہ کی آنکھوں میں اپنے لیے انتظار کی جھلک دیکھتا تو اس کا دل فخر و خوشی سے بھر جاتا۔ ایک نشہ سا طاری ہوجاتا اس پر اور اس کی آنکھ اپنے گردوپیش کی ہر شے میں حسن کا پہلو تلاش کرنے لگتی۔ اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا اسے دلکش نظر آتی۔ آسمان اچھا لگتا اور زمین خوب صورت نظر آتی۔ درخت' پھول' پودے اور نرم ہوا اور

پرندوں کی چہکار۔ یہ دنیا بہرحال اتنی حسین اور دلفریب اور دل ربا ہے کہ یہاں زندہ رہا جائے۔ علی کے دل میں بھی زندگی کی چاہت بڑھ جاتی۔ وہ بے مائیگی جو اس کے دل میں تھی' بے معنی محسوس ہونے لگتی اور یہ خیال اس کے احساس کو گرماتا کہ وہ کوئی بے مایہ اور بے وقعت آدمی نہیں ہے بلکہ اس کی ایک اہمیت اور قدر و قیمت ہے کہ وہ کسی کے لب کی مسکان اور کسی کی آنکھ کا انتظار ہے۔

رقیہ.... رقیہ....!

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں تھی۔ الجھن یہ تھی کہ رقیہ کے والد اور اس کی اماں آمنہ بیگم بھی اسے عزیز جانتے تھے۔ یوں اپنائیت سے پیش آتے گویا دیرینہ واقفیت یا قریبی عزیز داری ہو۔ علی کو اصرار کرکے بلاتے۔ گھنٹوں اس سے باتیں کرتے۔ گئے دنوں کی باتیں۔ وہ دن جو بہت خوب صورت تھے اور اب لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ آمنہ بیگم اس کی پسند کے کھانوں کا اکثر اہتمام کرتیں۔ "لو بھیا' یہ بھرواں کوفتے کھاؤ' تمہیں بہت پسند ہیں نا' میں نے سوچا' چلو آج علی میاں کے لیے کوفتے بنائے جائیں۔"

دو ایک بار اسے ساتھ لے کر بلیک پول اور مور کیمب گھومنے پھرنے بھی گئے۔ جب علی یہ چاہت' اپنائیت اور شفقت دیکھتا تو اسے ڈر لگتا۔ نہیں' ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ غلط بات ہے۔ بے شک چاہے جانے کی فطری آرزو اس کے دل میں بھی ہے مگر کیا وہ اس التفات کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اس کا دامن محدود ہے۔ اس کے راستے مسدود ہیں۔ وہ اس التفات کا بارِ گراں نہیں اٹھا سکتا۔ تو پھر کیا کرے؟ جتنا زیادہ وہ سوچتا ہے' اس کی الجھن بڑھتی اور خوف میں اضافہ ہوتا۔

پھر ایک دن اس کا خوف اس کے سامنے آگیا۔ جب نبی احمد نے اشاروں کنایوں میں حرفِ مدعا اس کے سامنے رکھ دیا۔

علی گھر واپس آیا تو سہ پہر کی دھوپ ڈھل رہی تھی۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ سٹنگ روم میں چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گیا اور کھڑکی سے باہر ویران نظروں سے دور تک پھیلے ویران آسمان کو گھورنے لگا۔ ایک شدید بے کسی اور لاچاری اس پر طاری تھی۔ اب کیا کرے وہ؟ نبی احمد نے بالآخر وہ تجویز اس کے سامنے رکھ دی جس کے تصور سے وہ خوف زدہ رہتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ صرف رقیہ کے بارے میں سوچتا ہے۔ صرف رقیہ کے سپنے دیکھتا ہے اور رقیہ کا نام ہونٹ سے ادا کرتا ہے تو اس کے دل کے ویرانوں میں پھول کھلتے چلے جاتے ہیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ رقیہ کے چہرے کی خزاں اس کی چاہت کے طفیل بہار میں بدل گئی ہے اور یہ بھی ایک سچائی ہے کہ وہ لوگ نصیب والے ہیں جنہیں رقیہ جیسی ہم سفر ملتی ہے۔

رقیہ... رقیہ....!

مگر کیا وہ نبی احمد کی تجویز کا جواب ہاں میں دے سکتا ہے۔

علی صوفے پر ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ اس کے دل و دماغ میں آتش فشاں پک رہا تھا جو بے کسی کے کھولتے ہوئے لاوے سے پُر تھا اور اس کے وجود میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ زندگی میں ایسے کئی مواقع آئے تھے جب اس نے بے بسی اور تذبذب کا سامنا کیا تھا اور فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کی تھی مگر ایسا لمحہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا' جب فیصلہ کرنا اسے ناممکن محسوس ہوا ہو۔ اور یہ ایسا ہی ایک لمحہ تھا۔ لاچاری.... اسے جکڑے ہوئے تھی' دماغ کی ٹمٹمائیں چیخ رہی تھیں اور وہ سوچنے اور طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہاں یا نہ' نبی احمد نے کہا تھا' ہفتے عشرے میں جواب دے دو۔ مگر وہ کیا جواب دے۔ اس کی تو مجبوری یہی ہے کہ اس کے دل میں رقیہ کے لیے محبت ہے۔ اگر ہاں کرے تو کیسے کرے۔ رقیہ بہت معصوم بھی ہے' نیک بھی اور مظلوم بھی۔ اس نے پہلے ہی بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ کیا وہ اسے اور دکھ دے سکتا ہے؟ ابھی پہلے فریب کا زخم رقیہ کے دل میں بھرا نہیں ہے۔ کیا وہ اس کے دل پر ایک اور کاری وار کر سکتا ہے۔ اگر وہ ہاں کرے تو کیا ہوگا۔ وہ تو غیر قانونی طور پر اس ملک میں آیا اور قانون سے بچتا پھر رہا تھا۔ اگر شادی کرے تو کیا ہوگا؟ کب تک قانون سے بچے گا اور کیسے بچے گا؟ ایک دن پکڑا جائے گا۔ تب کیا ہوگا' اسے واپس جانا ہوگا اور اس وقت جب اس کے فریب اور جھوٹ کا راز رقیہ پر منکشف ہوگا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ اس کا دل تو ناسور بن جائے گا۔

کیا وہ ایسا کر سکتا ہے؟

حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس ملک میں آئے دن لوگ اس فریب اور لالچ کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ اپنے ناجائز قیام کو جائز اور مستقل بنانے کے لیے شادیوں کی آڑ لیتے ہیں۔ جھوٹ بول کر' دھوکا دے کر' بلیک میل کرکے اور حتیٰ کہ رقم خرچ کرکے' علی کو یاد آیا کہ چند دن پہلے اس نے ایسے ہی ایک واقعے کے بارے میں سنا تھا۔ لیورپول میں ایک تیس سالہ شخص نے ایک ایسی عورت سے شادی کی تھی جس کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ مقصد صرف مستقل سکونت کا حصول تھا اور اس مقصد کے لیے اس شخص نے عورت کو چار ہزار پاؤنڈ کی رقم بھی ادا کی تھی' اسی نوعیت کے کچھ اور واقعات بھی علی نے غلام احمد اور اجمل کی زبانی سنے تھے۔ جن میں سے ایک واقعہ لیسٹر کے ایک سکھ نوجوان کے بارے میں تھا۔ سکھ نوجوان اسائلم پر تھا۔ اس نے ایک لڑکی کو دھوکا دے کر شادی کرلی۔ بعد ازاں وہ مختلف بہانوں سے اپنے قیام کو طول دیتا رہا۔ کبھی بیماری کا بہانہ' کبھی اپیل کے بعد پھر اپیل حتیٰ کہ پانچ سال گزر گئے۔ سکھ نوجوان دو بچوں کا باپ بن گیا پھر حکومت نے مقامی ممبر آف پارلیمنٹ اور چرچ لیڈروں کی مداخلت اور اپیل پر اسے آخر کار مستقل سکونت کی اجازت دے دی۔ مگر یہ تو دو ایک واقعات ہیں جن کا شمار استثنا میں ہی ہوگا۔ ضروری نہیں کہ اسے بھی کامیابی ہو۔ فرض کرو شادی کے بعد اسے ناکامی ہوئی'

جس کا امکان زیادہ ہے' تو کیا ہوگا؟

اس کی لاچاری تو یہی ہے کہ اس کے دل میں رقیہ کے لیے محبت ہے۔

وہ خاموش بیٹھا تھا۔ اپنے آپ سے بے خبر۔ ذہنی اذیت و کرب کی سولی پر لٹکا ہوا۔ تبھی یکایک میسج میں قدموں کی چاپ ابھری پھر دروازہ کھلا اور رفیق نے کمرے میں قدم رکھا۔ علی پر نظر پڑی تو رفیق ایک دم گھبرا گیا۔

"علی' یار کیا بات ہے۔ تم رو رہے ہو۔"

علی کے ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ نے دم توڑا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر آنسو پونچھے "نہیں یار' کوئی خاص بات نہیں۔ بس یونہی دل بھر آیا تھا۔"

"گھر یاد آرہا ہے؟" رفیق صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس نے جھوٹ کا سہارا لینا مناسب سمجھا۔ آہستہ سے بولا۔

"ہاں۔"

رفیق نے ایک سگریٹ جلائی پھر بولا "مت یاد کیا کرو۔ یادیں کبھی کبھی پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہیں اور آدمی کو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ تم بھی یادوں سے مغلوب مت ہو ورنہ حوصلہ ہار جاؤ گے۔ ویسے سب خیریت تو ہے؟"

"ہاں۔"

قدرے توقف کے بعد رفیق نے کہا "غلام احمد صبح بریڈ فورڈ گئے تھے۔ شاید ابھی تک آئے نہیں۔"

"ابھی تک تو آئے نہیں۔" علی نے جواب دیا۔ لمحہ بھر چپ رہا پھر بولا "تم پب نہیں گئے آج؟"

"بس اب جا ہی رہا ہوں۔"

"تو چلو میں بھی چلتا ہوں۔"

رفیق ایک دم چونک پڑا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا "تم... تم پب چلو گے۔ کیا پینے کا ارادہ ہے؟"

"یار' کیا حرج ہے۔ اگر ایک آدھ گلاس....." علی نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

رفیق چند لمحے حیرت زدہ اور ناقابل یقین نظروں سے علی کو گھورتا رہا پھر زور سے سر جھٹک کر بولا "کیا بات ہے یار' خیریت تو ہے۔ تم کچھ پریشان نظر آرہے ہو۔ کوئی دکھ ہے کیا؟"

"نہیں بھائی' سب ٹھیک ہے۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔" علی نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی "بس یونہی ذرا دل بھاری ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی ذرا تھوڑی سی۔" وہ یکایک چپ ہو گیا۔

"پہلے کبھی پی ہے؟" رفیق نے اسے تجسس سے گھورا۔

"ہاں یار وطن میں تھا تو چند ایک بار شغل کیا تھا۔ پھر راچڈیل میں بھی ایک دو بار پی تھی۔" اس کے ہونٹوں پر ایک شکستہ سی مسکراہٹ نظر آئی "تم اطمینان رکھو۔ شراب سے نا آشنا نہیں ہوں میں۔"

رفیق نے زور سے سانس لی "اچھی بات ہے' چلو مگر اتنا کہے دیتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔"

دونوں گھر سے نکلے۔ پب زیادہ دور نہیں تھا۔ گہری شام کی بوجھل ویرانی اور سکوت میں چل کر دونوں پب پہنچے۔ رفیق نے علی کو ایک چھوٹے کمرے میں جو تقریباً خالی تھا' ایک کرسی پر بٹھایا اور خود بار پر چلا گیا۔ چند منٹ بعد بیئر کے دو گلاس لے کر واپس آیا۔ سیاہی مائل سرخ شراب سے بھرا ایک گلاس علی کے سامنے رکھ کر بولا "لو بھئی' مجھے نہیں معلوم تم یہ حرکت کیوں کر رہے ہو لیکن تمہارا دل چاہ رہا تھا سو گلاس حاضر ہے۔"

علی نے گہری نظروں سے گلاس میں لبالب بھرے سیاہی مائل سرخ مشروب کو گھورا پھر ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور صرف ہاتھ ہی نہیں کانپ رہا تھا بلکہ اس کا پورا جسم ہیجان اور انتشار کی زد میں تھا۔ اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے اور دل کی دھڑکن اتنی بڑھ گئی تھی کہ لگتا تھا' دل کسی بھی لمحے اچانک پھٹ جائے گا اور آنکھیں.... ٹھہری ہوئی' خلا کی طرح ویران آنکھیں سرخ مشروب کے ہلکے زرد جھاگ پر یوں جمی ہوئی تھیں جیسے وہیں پر مر گئی ہوں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے گلاس تھام کر اٹھایا اور آہستہ سے کہا۔

"آؤ یار رفیق آج ایک جام پئیں۔"

"جام؟"

"ہاں' آج ایک جام پئیں۔
ٹوٹے ہوئے دلوں کے نام۔
تشنہ کام حسرتوں کے نام۔
اور ان محبتوں کے نام جو لٹ گئیں۔
آؤ ایک جام پئیں۔"

یہ کہہ کر اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔

رفیق نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

○☆○

گو ایک قیامت سے گزرنا تھا۔ خود اپنے دل کا خون کرنا تھا مگر کئی دن کے غور و فکر کے بعد علی نے طے کیا کہ راستہ بدل لینا ہی مناسب ہوگا کیونکہ وہ رقیہ کو مزید کوئی دکھ نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی اس کی نظروں میں سبک ہونے کا یارا اس میں تھا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ اگر وہ رقیہ کا ہاتھ نہیں تھامے گا تو یقیناً رقیہ کو بہت رنج ہوگا مگر یہ رنج بہت چھوٹا ہوگا اور جلد ہی دور ہو جائے گا۔ اسے توقع تھی کہ رقیہ کو جلد ہی کوئی نہ کوئی ایسا شریک سفر مل جائے گا جو نہ صرف اس سے بدرجہا بہتر ہوگا بلکہ رقیہ کے اس درد کا مداوا بھی بن جائے گا جو اسے پہلی شادی کی ناکامی سے ملا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کی اور خاص طور پر رقیہ کی فلاح اسی میں تھی۔ تاہم اس میں اتنی ہمت

نہیں تھی کہ رقیہ یا اس کے والد کو اپنے فیصلے سے مطلع کرتا۔ چنانچہ اس نے رقیہ سے ملنا بند کردیا۔ فیکٹری جانا مگر نئے راستے سے تاکہ رقیہ سے سامنا ہونے کا امکان نہ رہے۔ ایک اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس نے رقیہ کو اپنا پتا ٹھکانا غلط بتایا تھا۔ چنانچہ اس کا امکان بھی نہیں تھا کہ دیر تک ملاقات نہ ہونے کی صورت میں رقیہ اسے تلاش کرسکے گی۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی طے کیا کہ بلیک برن چھوڑ دے گا کیونکہ بلیک برن اور پریسٹن کے درمیان صرف آٹھ نو میل کا فاصلہ ہے۔ علی کے علم میں یہ بات تھی کہ رقیہ کے دو ایک شناسا بلیک برن میں رہتے ہیں اور وہ کبھی کبھی بلیک برن آتی بھی ہے۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کبھی ٹاؤن سنٹر میں یا والی رنج پر اس سے مڈھ بھیڑ ہو جائے۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہو ہی گیا تو نہ صرف اسے شرمندگی اٹھانی پڑے گی بلکہ رقیہ کو شدید صدمہ پہنچے گا۔ مناسب یہی ہے کہ وہ بلیک برن چھوڑ دے۔ ویسے بھی غیر قانونی افراد ایک ہی ٹھکانے پر مستقلاً جمے نہیں رہتے۔ اپنی سکونت بدلتے رہتے ہیں تاکہ گرفتاری کا امکان کم سے کم رہے۔ تاہم سوال یہ تھا کہ اگر بلیک برن چھوڑے تو جائے کہاں؟

اس سلسلے میں اس نے رفیق، غلام احمد اور اجمل سے گفتگو کی۔

اجمل کا ایک قریبی عزیز یارکشائر کے ایک شہر ڈیوزبری میں سکونت پذیر تھا۔ قابلِ بھروسا آدمی تھا۔ اجمل نے تجویز کیا کہ وہ ڈیوزبری چلا جائے۔ وہاں وہ محفوظ رہے گا اور ملازمت کا مسئلہ بھی جلد ہی حل ہو جائے گا۔ علی نے ہامی بھرلی۔

لیکن اسے ڈیوزبری جانے کا موقع نہیں ملا۔

اجمل سے گفتگو کے بعد، تیسرے دن وہ کام پر پہنچا تو کچھ ہی دیر بعد فورمین مسٹر ڈیوس نے اسے اور چند دوسرے افراد کو اپنے کیبن میں طلب کرلیا۔ مسٹر ڈیوس ایک پستہ قد مگر بھاری بھرکم آدمی تھے۔ گردن گینڈے کی طرح موٹی تھی۔ سر پر بال برائے نام تھے۔ بادی النظر میں وہ ایک بے رحم باکسر نظر آتے تھے مگر اندر سے بہت نرم دل تھے۔ ان کی آواز مہین اور قدرے نسوانی تھی جو ان کے چہرے اور جسامت کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ جب علی اور دوسرے افراد ان کے کیبن میں داخل ہوئے تو انہوں نے دروازہ بند کرلیا اور تشویش ناک نظروں سے ان سب کا جائزہ لیا۔

"بری خبر ہے۔" آخر کار انہوں نے باریک آواز میں کہا۔

"کیا بری خبر ہے مسٹر ڈیوس؟" ایک لڑکے نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"پولیس نے وڈیو فلم بنائی ہے۔"

"وڈیو فلم.... کیا مطلب ہے آپ کا مسٹر ڈیوس، صاف صاف کہئے نا؟" ایک اور آدمی نے کہا۔

"دیکھو، میں وضاحت کرتا ہوں۔" مسٹر ڈیوس نے فرداً فرداً ان سب کے چہروں پر نظر ڈالی۔ "تم نے دیکھا ہے کہ فیکٹری کے گیٹ کے مقابل ایک عمارت ہے۔ اس عمارت کی کسی بھی کھڑکی سے فیکٹری میں آنے جانے والوں کو صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ مجھے آج ہی پتا چلا ہے کہ گزشتہ تین چار دن سے پولیس، امیگریشن اور سوشل سیکیورٹی والوں نے وہاں ایک وڈیو کیمرا لگا رکھا تھا اور یہ کہ انہوں نے فیکٹری میں آنے جانے والوں کی ایک پوری فلم بنائی ہے۔" مسٹر ڈیوس رکے، ہونٹوں پر زبان پھیری پھر اضافہ کیا "اور ظاہر ہے کہ تم لوگ بھی اس فلم میں ہوگے اور اب وہ لوگ تفتیش کریں گے۔ تم لوگوں سے رابطہ قائم کرنے اور پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کریں گے۔ یقینی طور پر وہ میرے پاس بھی آئیں گے۔ میں تو خیر کسی نہ کسی طرح اس معاملے سے نمٹ لوں گا مگر مسئلہ تم لوگوں کا ہے۔"

"یہ تو واقعی بری خبر ہے۔" اس آدمی نے ہراساں ہو کر کہا۔ "اب ہم لوگ کیا کریں گے؟"

"تم لوگوں کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ ممکن ہے، وہ لوگ چھاپا ماریں لہٰذا بہتر ہوگا کہ تم سب فوراً عقبی دروازے سے نکلو اور گھر چلے جاؤ۔ دوبارہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے بقایا جات بعد میں بھجوا دیے جائیں گے۔"

"تو گویا آپ کا مطلب یہ ہے کہ اب ہم لوگ یہاں کام نہیں کرسکتے؟" یہ سوال علی نے کیا۔

"مجھے افسوس ہے۔" مسٹر ڈیوس نے نرمی سے جواب دیا۔

علی پچھلے دروازے سے باہر نکلا تو اس کے دل پر بھاری بوجھ تھا لیکن اس بوجھ میں خوف اور گھبراہٹ کا عنصر کم تھا' جھلاہٹ زیادہ تھی۔ تاہم اسے یہ احساس نہیں تھا کہ اس کی جھلاہٹ کس پر ہے۔ اپنے آپ پر یا اپنے حالات پر۔ یہ کیفیت اس وقت سے تھی جب سے اس نے طے کیا تھا کہ رقیہ سے نہیں ملے گا۔ اس نے اس پر توجہ دینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ بس ایک غصے اور ذہنی خلفشار کے عالم میں تیز تیز چلتا رہا۔ دیر تک بے مدعا اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ دھیرے دھیرے ذہن کا لاوا کچھ ٹھنڈا ہوا تو اس نے سوچنا شروع کیا کہ اگر ملازمت جاتی رہی تو اس میں تردد اور افسوس کی کیا بات ہے۔ اسے تو ویسے بھی چند ایک دن میں شہر چھوڑ کر جانا ہی تھا۔ اب دو چار دن پہلے ہی چلا جائے گا۔ گو رقیہ کو نہ دیکھنے اور اسے کھو دینے کا قلق اسے ہمیشہ رہے گا لیکن نوشتۂ تقدیر کو تسلیم کرنا بھی ازبس کہ ناگزیر ہے۔ رقیہ اس کی ہمدم اور ہم قدم نہیں بن سکتی۔ یہی حالات کا فیصلہ ہے اور اسے مان لینا چاہیے چنانچہ مناسب یہی ہوگا کہ وہ جلد از جلد بلیک برن چھوڑ کر چلا جائے اور رقیہ کو بھول جانے کی کوشش کرے۔ یہ طے کرنے کے بعد اسے کچھ سکون ملا۔ ایک سہارا سا محسوس ہوا چنانچہ وہ بس اسٹیشن پہنچا اور بس پکڑی۔

گھر پہنچا تو اندھیرا پھیلنا شروع ہو چکا تھا۔ غلام احمد حسبِ عادت صوفے پر براجمان تھے۔ سامنے ٹیبل پر لاگر کا گلاس دھرا تھا۔ رفیق دوسرے صوفے پر نیم دراز تھا۔ دونوں کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ علی نے رسماً سلام کیا۔ غلام احمد نے خوش مزاجی سے جواب دیا پھر اطلاع دی کہ علی کا ایک خط آیا ہے جو آتش دان پر پڑا ہے۔ علی نے شکریہ ادا کیا پھر لفافہ اٹھا کر کچن میں گھس گیا۔ ایک کپ چائے تیار کی اور پھر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بیڈ پر اطمینان سے نیم دراز ہو کر اس نے لفافہ کھولا اور خط پڑھنا شروع کیا۔ اس کی بہن نے لکھا تھا "بھیا' یہاں حالات معمول کے مطابق ہیں۔ امید ہے تم بھی بخیریت ہوگے۔ عموماً اماں تمہیں خط لکھتی ہیں۔ آج میں لکھ رہی ہوں اور وہ بھی ان کی چوری سے۔ اماں کو خط لکھنا تو میرے خط کا ذکر مت کرنا ورنہ وہ ناراض ہوں گی۔ بھیا' تمہیں پردیس گئے ہوئے ایک سال ہونے کو آیا۔ جب گئے تھے تو تم نے بے شمار خوش آئند باتیں کی تھیں۔ تم نے کہا تھا کہ انگلستان پہنچتے ہی ہمارے حالات بدل جائیں گے کیونکہ اس ملک میں بہت سہولتیں ہیں۔ پیسے کی فراوانی ہے۔ آسائشیں چٹکی بجاتے حاصل ہو جاتی ہیں۔ تم نے بڑے وثوق سے اور جوش سے کہا تھا کہ جس کسمپرسی اور عسرت میں ہم وقت گزار رہے ہیں' اس سے چشم زدن میں چھٹکارا مل جائے گا۔ بھیا' مجھے پتا نہیں' ایسا ہے یا نہیں۔ تاہم میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ تم کو گئے ہوئے اتنے دن ہو گئے مگر ابھی تک اس صبح کی طلوع کے آثار نمودار نہیں ہوئے جس کا سپنا تم نے دکھایا تھا۔ ہو سکتا ہے' اس ملک میں بہت پیسہ ہو' مگر ہمیں ابھی تک تو کچھ نہیں ملا۔ تم پابندی سے روپیہ نہیں بھیجتے اور کبھی کبھی کم بھی بھیجتے ہو۔ یہاں ہم لوگوں کو اخراجات کے سلسلے میں اکثر بڑی پریشانی ہو جاتی ہے۔ جو قرض تم نے لیا تھا وہ بھی ابھی پوری طرح ادا نہیں ہوا۔ تم اپنے خطوط میں بار بار لکھتے ہو کہ تھوڑے دن اور انتظار کرنا ہوگا۔ آخر کب تک انتظار کرنا ہوگا۔ کئی مسائل سر پر ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ انتظار طویل سے طویل تر ہوتا چلا جائے اور مسائل کے حل کی نوبت ہی نہ آئے۔ بھیا' مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کچھ مجھے لکھنا چاہیے یا نہیں لیکن پچھلے کچھ دن سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ یہ تمام باتیں تمہارے علم میں لانا ضروری ہیں کیونکہ تم ہی اس کنبے کی ذمے داری اٹھاتے ہو۔ نیز یہ بات بھی تمہارے علم میں لانا شاید غیر مناسب نہ ہوگا کہ اماں گزشتہ چار چھ ہفتوں سے بیمار ہیں۔ جب تب حرارت ہو جاتی ہے۔ کمزور بہت ہو گئی ہیں۔ ہر وقت گم صم اور کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی گمشدہ شے کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ ہم سب ان کی دیکھ بھال اور علاج میں برابر جٹے رہتے ہیں۔ انہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ تاہم افاقے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ پچھلے ہفتے ڈاکٹر انصاری کے کلینک میں پورا چیک اپ کروایا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے اس بات کی تصدیق تو خیر کر دی کہ کسی تشویش ناک بیماری کی علامات نہیں ہیں لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ اماں کی صحت و شفا کا انحصار اس پر ہے کہ وہ خوش رہا کریں۔ مگر وہ خوش نہیں رہتیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ لاشعوری طور پر تمہیں ڈھونڈتی ہیں اور جب تم نظر نہیں آتے تو ان کے دل کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن میرا یہ بھی خیال ہے کہ اماں ہمیشہ سے حقیقت پسند اور عملی تھیں اور آج بھی ہیں چنانچہ جس امید کی انگلی تھام کر انہوں نے تمہیں پردیس کی صعوبت جھیلنے کی اجازت دی تھی اگر اس امید کی تکمیل کے کوئی آثار نظر آتے تو وہ ضرور خوش اور مطمئن ہوتیں۔ امید ہے بھیا تم میرا مطلب سمجھ رہے ہوگے۔ وہ ماں ہیں' تین بیٹیوں کا بوجھ سر پر ہے لیکن ہوا یہ ہے کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور اگر کچھ ہوا ہے تو یہ کہ سر کا بوجھ جوں کا توں سر پر ہے اور بیٹا بھی نظروں سے دور ہوا۔ اماں کے حوالے سے تو یہ سودا گھاٹے کا رہا۔ انہوں نے تمہیں کبھی نہیں لکھا اور کبھی لکھیں گی بھی نہیں لیکن دبی زبان سے چند ایک بار کہہ ضرور چکی ہیں کہ اگر کچھ حاصل نہیں ہوتا تو بہتر ہے کہ علی واپس ہی آجائے۔ جو دال روٹی اوپر والا دے گا' ہم مل بانٹ کر کھا لیں گے۔ یہ اماں کے احساسات ہیں۔ تاہم ان سطور کے لکھنے سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ تم واقعی واپس آجاؤ۔ بس اتنا کرو کہ اماں کو ذرا جلد جلد خط لکھا کرو اور کچھ ایسا کرو کہ مسائل کے حل کی کوئی صورت نکلے۔ نیز یہ کہ اگر ممکن ہو تو دو چار ہفتے کے لیے آجاؤ' ویزا

لے کر۔ پھر چلے جانا۔ تمہیں دیکھ کر اماں کو مسرت اور سکون کا احساس ہوگا اور اس سے ان کی صحت پر خوش گوار اثر پڑے گا۔"

علی یکایک اٹھ کر پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ بہن کا خط اس کے ہاتھوں میں تھا جو ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور خط کی طرح اس کا دل بھی کانپ رہا تھا۔ ایک مایوسی' رنج اور شکستگی کا پُرعذاب احساس اس کے ذہن میں پھیلتا جارہا تھا۔ اس کی اماں بیمار ہیں۔ بہن نے لکھا تھا' وہ تمہیں کبھی نہیں لکھیں گی۔ ہاں' ٹھیک ہے' وہ اسے کبھی نہیں لکھیں گی کیونکہ وہ بہت مہتا والی مگر حقیقت پسند' باہمت اور صابر عورت ہیں۔ وہ سارے دکھ' سارے عذاب اپنی جان پر جھیل لیں گی مگر اسے کبھی کچھ نہیں لکھیں گی۔ انہوں نے ایک سپنا آنکھوں میں سجا کر اسے پردیس کی خاک چھاننے کی اجازت دی ہے مگر اس نے اب تک کیا کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے اس سپنے کی عملی تعبیر کی جستجو میں اپنی جانب سے کوئی کوتاہی شاید نہ کی مگر پھر بھی حاصل کیا ہوا۔ وہ سپنا ابھی تک ان کی آنکھوں میں جاگ رہا ہے اور اس کی ساری جدوجہد ابھی تک ثمرِ لاحاصل کے مترادف ہے۔ ایک سال ہونے کو آیا۔ انتظار کے عذاب سے پُر ہو تو یہ عرصہ بہت طویل ہوجاتا ہے۔ اماں بھی یقیناً انتظار کی اذیت کو برداشت نہیں کرسکیں اور بیمار ہوگئیں۔ پتا نہیں اب وہ کیسی ہیں۔ ممکن ہے اس نے قصداً ان کی بیماری کے ذکر کے لیے نرم زبان استعمال کی ہو جبکہ حقیقتاً وہ زیادہ بیمار ہوں۔ ممکن ہے ان کی علالت خطرناک ہو۔ نہیں' نہیں' ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ میری اماں' بالکل ٹھیک ہوں گی۔ بہن نے غالباً یونہی لکھ دیا ہے۔ اماں کو معمولی نزلہ' زکام اور بخار کی شکایت ہوگی۔ کمزور ہیں' یہ شکایت تو اکثر انہیں ہوجاتی تھی مگر دو چار روز دوا لے کر طبیعت بحال ہوجاتی تھی۔ ہاں یقیناً یہی بات ہوگی اور اب وہ بالکل تندرست ہوگئی ہوں گی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا مگر تشفی نہیں ہوئی۔ دل میں بیٹھے ہوئے چور نے فہمائش کی۔ کیوں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ تمہاری اماں بیمار ہیں اور شاید خاصی علیل ہیں ورنہ بہن تمہیں کبھی نہ لکھتی۔ ماں کی طرح وہ بھی بہت سمجھ دار ہے۔ وہ تمہیں بلاوجہ پریشان کرنا کبھی مناسب نہ سمجھتی اگر ماں کی طبیعت واقعی زیادہ خراب نہ ہوتی۔ یہ ایسا خیال تھا کہ علی کی گھبراہٹ مزید بڑھ گئی۔ دل میں ایک وحشت سی اٹھی اور ایک خواہش.... ایک شدید خواہش کہ وہ کسی طرح چلا جائے۔ فوراً اپنی اماں کے پاس چلا جائے۔

گزشتہ کچھ دن کچھ عجیب ہی رنگ میں گزرے تھے۔ پہلے اسے رقیہ سے ترکِ تعلق کا دل آزار اور جان سوز فیصلہ کرنا پڑا پھر شہر چھوڑنے کا ارادہ اور پولیس وڈیو کی تشویش ناک خبر اور اب یہ خط۔ اس نے ایک بار پھر خط کی سیاہ تحریر کو گھورا۔ بہن نے لکھا تھا۔ "دو چار ہفتے کے لیے آجاؤ' ویزا لے کر۔ پھر چلے جانا۔" لیکن اس کی بہن کو کیا علم تھا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ ویزا تو درکنار' وہ تو پاسپورٹ تک استعمال نہیں کرسکتا کیونکہ وہ ایک پنجرے میں قید ہے۔ اس پنجرے کی کھڑکی بند ہے اور اس پر ایک تالا پڑا ہوا ہے جو بظاہر بہت خوب صورت ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس تالے کی کوئی چابی نہیں ہے۔ اگر وہ باہر نکلنا چاہے تو صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ پنجرے کی تیلیاں توڑ دے۔

مگر کیا وہ تیلیاں توڑ سکتا ہے؟

معاً بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اسی وقت یکایک سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ابھری پھر دروازہ کھلا اور رفیق اندر داخل ہوا۔ علی نے رفیق کو دیکھا تو سٹ پٹا گیا کیونکہ رفیق کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ علی نے گھبرا کر کہا "رفیق.... کیا بات ہے یار؟"

"یار علی' غضب ہوگیا۔" رفیق کی آواز سے شدید پریشانی کا اظہار ہورہا تھا۔

"کیوں.... کیا ہوا؟"

"یار دو امیگریشن افسر آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک پولیس افسر بھی ہے۔ وہ لوگ تمہیں پوچھ رہے ہیں۔"

علی کا دل ایک دم بیٹھنے لگا "مجھے پوچھ رہے ہیں۔ مگر کیوں؟ یہ کیسے ہوا؟ انہیں کیا پتا کہ میں یہاں ہوں۔"

"ان کے پاس تمہاری ایک تصویر ہے۔" رفیق کی سانس پھول رہی تھی "ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے تمہاری فیکٹری میں آنے جانے والوں کی ایک وڈیو فلم بنائی تھی اور تمہاری تصویر اسی

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لینگویج کورس	سیکرٹریل سٹڈیز اسٹیولرڈ	بیوٹی پارلر کورس
اردو مڈل کورس (تعلیم بالغاں)	ڈریسمیکنگ / ایئر ہیکنگ	ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ
ریڈیو ٹی وی ریکارڈنگ	الیکٹریشن / کمپیوٹر	اسکول ٹیچنگ میتھڈ
انٹیریئر ڈیکوریشن	فوٹوگرافی / صحافت	امپورٹ ایکسپورٹ
فزیکل ہیولی ٹرینڈ سلمنگ	شمسی توانائی / کوکنگ بیکنگ	فلاور میکنگ
آئل پینٹنگ	میڈیکل ایڈ / ڈینٹل ٹیکنیشن	لیڈیز ٹیلرنگ
ایگریکلچر سپروائزر (جدید زراعت)	پبلک ریلیشن آفیسر / نیوز رپورٹر	مہر سازی

یہ تمام کورسز اردو میں سینکڑوں تصاویر اور ڈایاگرام کے ساتھ پرنٹیڈ کتب کی صورت میں بذریعہ ڈاک طلبہ کو گھر پر کراتے ہیں۔ کورس کے دوران اور سند لینے کے بعد بھی مکمل رہنمائی۔ ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ جوابی لفافے کیساتھ خط لکھیں۔

اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس 1237
جی۔ پی۔ او، اسلام آباد

وڈیو فلم سے حاصل کی تھی۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ کئی دن سے تمہارے بارے میں چھان بین کررہے ہیں۔ ان کے پاس غالباً کچھ اطلاعات راچڈیل پولیس سے بھی آئی ہیں۔ اب وہ تم سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں اور غالباً تمہارا پاسپورٹ بھی دیکھیں گے۔"

"یار' یہ تو واقعی غضب ہوگیا۔"

"ہاں' انہوں نے فیکٹری میں فورمین سے پوچھ گچھ کی تھی اور کچھ دوسرے ورکروں سے بھی۔ اس طرح انہیں معلوم ہوگیا کہ تم اس فیکٹری میں کام کرتے ہو۔"

"یار' یہ تو ٹھیک ہے۔" علی نے وحشت بھری نظروں سے رفیق کو گھورا "مگر انہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں یہاں رہتا ہوں۔"

"پتا نہیں' وہ لوگ کئی دن سے تفتیش کررہے ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے تمہارا پیچھا کیا ہو۔"

علی چند لمحے سکتے کی کیفیت میں کھڑا رہا اور دہشت بھری نظروں سے رفیق کو گھورتا رہا پھر گھبرا کر بولا "یار' یہ تو واقعی بڑی مصیبت ہوگئی۔ اب کیا کروں؟"

"کرنا کیا ہے یار' بھاگو' جلدی کرو۔" رفیق نے تیزی سے کہا۔ "میں نے ان سے کہا ہے کہ تم یہاں نہیں ہو۔ انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مگر اس سے پہلے کہ بات بگڑ جائے' تم فوراً نکل جاؤ۔"

"کیسے نکل جاؤں۔ نیچے تو وہ لوگ ہیں؟"

"نہیں۔ غلام احمد نے انہیں بیرونی کمرے میں روکا ہوا ہے۔ تم عقبی دروازے سے نکل کر چلے جاؤ مگر جلدی کرو۔"

علی نے جھپٹ کر کوٹ اٹھایا' پھرتی سے جوتے پہنے اور عجلت سے سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ رفیق نے اسے دبے قدموں اترنے کی تاکید کی۔ مبادا قدموں کی آواز بیرونی کمرے تک پہنچ جائے۔ نیچے پہنچ کر وہ لونگ روم میں داخل ہوا پھر کچن سے گزر کر بیک یارڈ سے ہوتا ہوا عقبی گلی میں نکل گیا۔ اس کا دل خوف' گھبراہٹ اور وحشت کے باعث زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سردی کے باوجود گردن اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ اس نے سراسیمہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بائیں جانب دوڑ پڑا۔ گلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ کوڑے کے ڈرم رکھے تھے اور یہاں وہاں کچھ دیر پہلے ہونے والی بارش کا پانی پھیلا ہوا تھا۔ علی گردوپیش پر توجہ دیے بغیر بھاگتا چلا گیا۔ جسم وجان کی پوری قوت سے اور تیز..... اور تیز..... بھاگتے رہو کیونکہ بری گھڑی تمہارے تعاقب میں ہے۔ اگر ذرا سا چوک گئے تو دھر لیے جاؤ گے۔ پھر مقدمہ چلے گا' سزا ہوگی پھر جہاز پر بٹھا دیے جاؤ گے۔ چنانچہ بھاگتے رہو۔ پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔ بس بھاگتے رہو اور تیز..... اور تیز..... مگر بھاگ کر جاؤ گے کہاں اور کب تک بھاگو گے۔ اتنے دن ہوگئے ہیں تمہیں بھاگتے ہوئے مگر وہ بری گھڑی اب بھی تمہارے تعاقب میں ہے۔ تم اس سے بچ کر کہاں جاؤ گے۔ کیا کہیں کوئی جائے پناہ ہے؟ نہیں' کوئی پناہ گاہ نہیں ہے کیونکہ تمہارا کوئی نام نہیں ہے' کوئی پہچان نہیں ہے۔ تم اثبات نہیں محض نفی ہو اور تم جہاں بھی جاؤ گے' وہ بری گھڑی' وہ ساعتِ عذاب تمہارے تعاقب میں ہوگی۔ چنانچہ کب تک بھاگو گے۔ آخر اس کا کوئی انجام ہے یا نہیں' کوئی اختتام ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم "حاصل" کی جستجو میں "لاحاصل" کے پیچھے بھاگ رہے ہو۔ ہاں شاید یہی سچ ہے۔ لاحاصل ہی تمہارا مقدر ہے۔ تو پھر کیا فائدہ۔ وہ خواب جو تمہاری اماں نے دیکھا تھا' وہ تو ان کی آنکھوں میں مر رہا ہے اور تم بھاگ رہے ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ کب تک بھاگو گے۔ راچڈیل سے یہاں آئے تھے۔ یہاں سے کہیں اور جاؤ گے۔ اس کے بعد کہیں اور' اور اس کے بعد کہیں اور.....

یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟

وہ یکایک رک گیا۔ اس کے کانوں میں اس کی بہن کی آواز گونجی۔

"اماں بہت بیمار ہیں۔"

وہ چند لمحے کھڑا رہا اور جلتی ہوئی آنکھوں سے اندھیرے میں گھورتا رہا۔ اس کے وجود کے اندر ایک طوفان برپا تھا۔ کشمکش اور پس وپیش کا تیز طوفان۔ کیا کرے..... کیا کرے۔ آگے تو اندھیرا ہے اور پیچھے بھی اندھیرا ہے۔ روشنی کہیں نہیں ہے۔ تو پھر کیا کرے۔ چند لمحے شدید کرب میں گزرے پھر وہ یکایک گھوما' قدم آگے بڑھایا اور اپنے دھڑکتے دل اور پھولتی سانسوں کو سنبھالتا ہوا گھر تک واپس پہنچا۔ عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بیک یارڈ میں داخل ہوا۔ کچن سے ہوکر لونگ روم سے گزرتا ہوا پیسج میں پہنچا پھر بیرونی کمرے میں قدم رکھا۔

کمرے میں ایک باوردی پولیس آفیسر تھا۔ دو سادہ لباس والے تھے جن کا تعلق امیگریشن سے تھا۔ انہوں نے حیرت سے علی کو دیکھا۔ غلام احمد اور رفیق کی نظریں اس پر پڑیں تو ان کے چہرے فق ہوگئے۔ رفیق نے سٹ پٹا کر کہا۔ "ارے تم؟"

لیکن علی نے رفیق کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ امیگریشن افسر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم کون ہو؟" امیگریشن افسر نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

علی کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس کے اعصاب منجمد ہورہے تھے اور دل یوں ڈوب رہا تھا جیسے مر رہا ہو۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور آہستہ سے کہا "میرا نام آصف علی ہے۔ شاید آپ لوگ میری ہی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔"

علی نے جملہ پورا کیا اور معاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھاری بوجھ اس کے دل سے اتر گیا ہو۔